پرکاش پنڈت

S
158
پرکاش پنڈت

ناشر:
سٹار پبلیکیشنز
۲۷۱۵ - دریا گنج ، دہلی

قیمت ایک روپیہ

سول ایجنٹس:
پنجابی پستک بھنڈار
مدیبہ کلاں دہلی

ہمارا مقصد ہے
کم قیمت میں معیاری ادب پیش کرنا
اس مقصد کے پیش نظر ہر تین ماہ میں دس پاکٹ بکس
شائع کی جاتی ہیں ــــ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ
کتاب ہے ــــ ناشر

مجاز

اور

اُس کی

شاعری

مرتبہ

پرکاش پنڈت

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر

اب تو بس آواز ہی آواز ہے

مجاز

ترتیب

منظومات

غزلیات :

متفرق اشعار

★ لڑکھڑاتا تعارف

"مجاز اُردو شاعری کیٹس ہے۔"

"مجاز صحیح ترقی پسند شاعر ہے۔"

"مجاز شرابی ہے۔"

"مجاز نیم دیوانہ لیکن پُرخلوص انسان ہے۔"

"مجاز بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہے۔"

"مجاز کے نام پر گرلز کالج علی گڑھ میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں کہ مجاز کس کے حصّے میں پڑتا ہے — اُس کی نظمیں تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچی جاتی تھیں اور کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام اُسکے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔"

"مجاز کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی عورت ہے۔"

"مجاز..........."

مجازؔ سے ملنے سے پہلے مجاز کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پڑھا اور سُنا کرتا تھا اور اُس کی رنگا رنگ تصویریں میں نے اس کی تخلیقات میں بھی دیکھی تھی خاص طور پر اُس کی نظم "آوارہ" میں تو میں نے اسے مجسّم شکل میں دیکھ لیا تھا جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ پھرنے والا شاعر، جسے رات سنبھ ہنس ہنس کر ایک طرف سے خانے اور محبوبہ کے کاشانے میں چلنے کو کہتی ہے۔ اور دوسری طرف سناٹا ویرانے ہیں۔ جو محبت کی ناکامی اور دنیا کی بے توجہی کا شکار ہے۔ جس کے دل میں بیکار زندگی کی اداسی بھی ہے۔ اور ماحول کی تلخیوں کے خلاف دہکتی جوالا بھی "آوارہ" میں میں نے مجاز کی پوری شخصیت دیکھ لی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس باغ و بہار انسان کو قریب سے دیکھنے کی میری خواہش اور بھی شدید ہو گئی تھی۔

یہ خواہش بہت عرصہ بعد ۱۹۴۷ء میں جا کر پوری ہوئی جب ملک کی تقسیم کے بعد میں لاہور سے چل کر دلّی میں آ بسا تھا۔ اور میں نے اور ساحر لدھیانوی نے مل کر رسالہ "شاہراہ" کی داغ بیل ڈالی تھی۔ مجازؔ سے میری ملاقات بڑے ڈرامائی انداز سے ہوئی۔ رات کے دس گیارہ کا وقت ہوگا۔ میں اور ساحر نیا محلہ پل بنگش کے ایک مکان میں منتقل ہو رہے تھے۔ محلہ مسلمانوں کا تھا۔ اور شہر کی فضا مسلمانوں کے خلاف تھی۔ یعنی ایک چیز میرے خلاف تھی اور دوسری ساحر کے۔ لہٰذا ہم چاہتے کہ بڑی مشکلوں سے ہاتھ آئے ہوئے مکان پر ہمارے قبضہ کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ساحر چپکے چپکے سامان ڈھو رہا تھا۔ اور میں محلہ کے باہر سڑک کے کنارے کھڑا سامان کی نگرانی کر رہا تھا کہ ایکا ایک ایک دُبلا پتلا شخص بُری طرح لڑکھڑاتا اور بڑبڑاتا میرے سامنے آکھڑا ہوا۔

"اختر شیرانی مر گیا —— ہائے اختر شیرانی تو اُردو کا بہت بڑا شاعر تھا۔"

وہ شخص بار بار یہی جملہ دہرا رہا تھا۔ ہاتھوں سے خلا میں اُلٹے سیدھے خطوط بنا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے میزبان کو گالیاں اور کوسنے دے رہا تھا۔ جس نے گھر میں شراب ہونے پر بھی اُسے مزید شراب نہ پینے دی تھی اور اپنی موٹر میں بٹھا کر ریلوے پل کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس آفتِ ناگہانی سے میں ایک دم بوکھلا گیا۔ کچھ لوگ بھی ہمارے اِردگرد جمع ہو گئے تھے۔ لہٰذا معاملہ کی نزاکت کی وجہ سے نہ جانے اس شرابی سے کس طرح پیش آتا کہ عین اسی موقع پر کہیں سے جوشؔ ملیح آبادی نکل آئے (ان دنوں وہ اسی محلہ میں رہتے تھے) اور مجھے پہچان کر بولے۔ "اسے سنبھالو پرکاش یہ مجازؔ ہے۔"

مجازؔ کو سنبھالنے کے بجائے ضرورت اگرچہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی تھی۔ لیکن مجازؔ کا نام سنتے ہی میں ایک دم چونک پڑا اور دوسرے لمحہ میں سب کچھ فراموش کرتے ہوئے میں اس طرح لپٹ گیا گویا برسوں پرانی دوستی ہو۔

مجازؔ سے ظاہر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت میری سالوں پُرانی دوستی نہ تھی۔ لیکن آج پندرہ برس بعد یہ سطریں لکھتے ہوئے بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مجازؔ کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ ہوش میں بے ہوشی میں۔ شراب کے لئے بھٹکتے ہوئے اور شراب پی کر بھٹکتے ہوئے۔ انتہائی گم سم حالت میں اور انتہائی چہکتے ہوئے۔ اپنی زندگی کی مایوسیوں اور ناکامیوں کا ملکہ زندگی ہی کا مذاق اُڑاتے ہوئے۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے مجازؔ کو میں نے خوب دیکھا ہے۔ اس کی شاعری اور شخصیت پر لکھی ہوئی قریب قریب ہر تحریر پڑھی ہے اس کے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملا ہوں۔ دو چار بار مجھے اس کی میزبانی کا بھی شرف حاصل ہو چکا ہے اور میں اس کی قبر پر سجدہ بھی کر آیا ہوں، اور یوں میں

اپنے آپ کو.... اُن لوگوں میں شمار کرتا ہوں جنہیں مجاز اور اُس کی شاعری پر قدرے وثوق سے کچھ لکھنے کا حق پہنچتا ہے۔

مجاز ان دنوں قریب قریب ایک مہینہ ہمارے ساتھ رہا۔ اُس کی اندھا دھند شراب نوشی کے بارے میں میں پہلے سے باخبر تھا اور پہلی ملاقات میں مجھے اس کا عملی تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ لیکن اس ایک مہینہ میں میں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ مجاز شراب کو نہیں پیتا، شراب بڑی بے دردی سے مجاز کو پیتی جارہی ہے۔ یہ احساس ۱۹۵۲ء میں اور زیادہ شدید ہو گیا جب میرے مکان واقع چاندنی چوک میں مجاز لگاتار کئی مہینے میرے ساتھ رہا۔ اس بار مجاز کو میں اُردو بازار کی ایک دکان سے نیم مردہ حالت میں اُٹھا کر لایا تھا اور تہیہ کیا تھا۔ کہ جیسے بھی ہو گا۔ مجاز کو شراب نہیں پینے دوں گا۔ لیکن افسوس کہ میری تمام تر کوششیں رائیگاں گئیں چند دن بعد ہی مجاز نے پھر سے پینی شروع کر دی اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ زندگی میں تیسری بار اُس پر نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا۔ اُن دنوں اُس نے دلّی میں ایسی ایسی خاک چھانی، جیسی محرومی کے تماشے دکھائے کہ یقین نہ آتا تھا کہ یہی وہ مجاز ہے جو ہوش کے عالم میں کسی چھچھوری حرکت کو گناہ سے کم نہ سمجھتا تھا۔ جسے ہر وقت چھوٹے بڑے کا پاس رہتا تھا اور جو اس درجہ شرمیلا اور گم گو تھا کہ عورت کے سامنے اُس کی نظریں تک نہ اُٹھتی تھیں۔

یوں تو مجاز کو شروع سے بے خوابی کا عارضہ تھا اور اسی وجہ سے گھر کے لوگوں نے اُس کا نام "جگن" رکھ چھوڑا تھا۔ لیکن اُس زمانہ میں شراب کی غنودگی کے علاوہ مجاز کو نیند نہ آتی تھی۔ اکثر رات کو ڈیڑھ دو بجے گھر پہنچتا یا پہنچایا جاتا تھا۔ دروازہ کھولنے اور اُسے اُس کے کمرے میں پہنچا کر کھانا

کھلانے کی میں نے ملازم کو تاکید کر رکھی تھی۔ لیکن کیسا کمرہ اور کس کا کھانا؛ مجاز پر تو اُس وقت کسی سے باتیں کرنے کا موڈ سوار ہوتا تھا۔ لہٰذا دروازہ کھلتے ہی سیدھا ہمارے سونے کے کمرے کی طرف لپکتا۔ دروازہ چونکہ اندر سے بند ہوتا تھا اس لئے باہر سے اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ "حد ہے بھئی! ابھی تک سو رہے ہو؟"

اور یہ آواز صبح چار پانچ بجے پھر سنائی دیتی۔ "حد ہے بھئی ابھی تک سو رہے ہو۔"

شراب نوشی پر میری عائد کردہ پابندیوں سے نجات پانے کا مجاز نے یہ طریقہ ڈھونڈھ نکالا تھا کہ رات کو وہ میرے سوتے میں گھر آتا تھا اور صبح میرے سوتے میں گھر سے نکل جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو دو دو تین تین دن تک سوائے افسوسناک خبروں کے اُس کا کچھ اتہ پتہ نہ چلتا تھا۔ اُسے جاننے اور اُسے چاہنے والے لوگ اُس سے کنی کتراتے لیکن مجاز کو اس کا کچھ احساس نہ ہوتا۔ کپڑے میلے ہیں یا پھٹ گئے، اس کی بھی فکر نہ ہوتی — کتنے روز سے کچھ نہیں کھایا اس کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ہوتی۔ اگر کوئی دُھن تھی تو صرف یہ کہاں سے، کب اور کتنی شراب ملے گی۔ دن رات کی شراب نوشی کا نتیجہ ظاہر ہے۔ نروس بریک ڈاؤن کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہوا۔ کسی طرح سے پکڑ دھکڑ کے رانچی کے مینٹل ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ لیکن صحت یاب ہو کے نکلا تو یہ سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ ....

.... اور یہ سلسلہ ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء جبکہ مجاز کی عمر صرف ۴۴ برس کی تھی، بلرام پور ہسپتال میں اُس وقت ختم ہوا جب چند دوستوں کے ساتھ مجاز نے بُری طرح شراب پی، دوست تو اپنے گھروں کو چلے گئے اور مجاز رات

شراب خانے کی کھلی چھت پر سردی میں پڑا رہا اور اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔
ہمارا ملک چونکہ مُردہ پرست ہے اور اس لئے مجازؔ کی موت پر بے شمار مضامین لکھے گئے۔ ماتمی اور تعزیری جلسے ہوئے۔ رسالوں کے خاص نمبر نکلے اور ان لوگوں نے بھی بڑی شدّومد کے ساتھ اظہار افسوس کیا جو اس کی زبان سے اُس کا کلام اور پھلجھڑیاں[۱] سننے کیلئے اُسے شراب کی شکل میں زہر پلایا کرتے تھے۔ مجھے دِلّی کی کئی ایسی محفلیں یاد ہیں جہاں اوپر کے طبقہ کی نازنینوں کا جھرمٹ ہوتا تھا جہاں مجازؔ کو تابڑ توڑ پیگ پیش کئے جاتے تھے اور اُس سے تابڑ توڑ نظمیں اور غزلیں سُنی جاتی تھیں۔ لیکن جب میزبان دیکھتے کہ مجازؔ کا سانس پھول گیا ہے اور اب اُس سے اور کچھ نہ سُنایا جائے گا۔ یا اس کی جنسی محرومی کے عود کر آنے کی حدِ فاصل آ گئی ہے تو وہ اُسے ڈرائیور کے حوالے کر دیتے تھے کہ وہ اُسے اُس کی جائے رہائش پر چھوڑ آئے یا پھر اپنے بنگلے کے کسی کمرے

---

[۱] اس میں شک نہیں کہ مجازؔ کی زندگی میں جتنی تلخیاں تھیں وہ سب خود اسی کی پروردہ تھیں لیکن وہ ہمیشہ اپنی انہیں تلخیوں سے کھیلا اور انہی تلخیوں سے وہ اپنے لئے شیرینی بھی نچوڑتا رہا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کی کربناک زندگی گزارنے پر بھی اُس نے اپنی فطری شگفتگی اور بذلہ سنجی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا اور ہمیشہ فقرے بازیوں سے دوستوں کا دل خوش کرتا رہتا تھا۔

ایک بار بے تکلف دوستوں کی ایک محفل میں ایک دوست ایسے آئے جن کی بیوی حال ہی میں داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ اور وہ بہت اداس تھے اور تمام دوست ان کو صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ ایک دوست نے تجویز پیش کی کہ دوسری شادی تو آپ بہرحال کریں گے اس لئے اگر جلدی کر لیں تو یہ غم دور ہو جائے گا۔ ان صاحب نے بڑی

ہیں منتقل کر دیتے تھے۔ مجاز کی شراب نوشی کے لئے میں مجاز کو بری الذمہ نہیں سمجھتا لیکن اس کی جواںمرگی میں میں اُن کرم فرماؤں کو برابر کا قصور وار سمجھتا ہوں جنہوں نے مجاز کے حالات زندگی سے واقف ہوتے ہوئے اُسے پکڑ پکڑ کر شراب پلائی۔

مجاز کے حالات زندگی افسوسناک حد تک ناخوشگوار تھے۔ کبھی وہ

سنجیدگی سے کہا کہ جی ہاں شادی تو میں ضرور کروں گا لیکن ارادہ ہے کہ کسی بیوہ سے شادی کروں۔" یہ سننا تھا کہ مجاز نے بڑا رو کھا منہ بنا کر کہا۔

" بھائی جان! آپ شادی کر لیجئے۔ وہ بے چاری خود ہی بیوہ ہو جائے گی۔" اب کون تھا جو اس بھرپور فقرے پہ ہنسی ضبط کر سکتا۔ خود ان صاحب کی ساری سنجیدگی جاتی رہی اور کھکھلا پڑے۔"

اسی طرح ایک بار ایک ادبی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے جب سردار جعفری نے اقبال کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے ——— اُسے تخریب پسند رجعت پسند وغیرہ کہا تو سامعین میں سے اقبال کے کسی معتقد نے اُٹھ کر انہیں ٹوک دیا اور چِلّا کر کہا۔" اپنی یہ بکواس بند کیجئے۔ اقبال کی روح کو صدمہ پہنچ رہا ہے۔"

لیکن اس سے پہلے کہ جلسے میں کوئی گڑبڑ پیدا ہوتی' یا سردار جعفری اپنے اس ناقد کی بات کا کوئی جواب دیتے۔ مجاز نے اُٹھ کر مائکروفون ہاتھ میں لے کر کہا۔

"جناب صدمہ تو آپ کی روح کو پہنچ رہا ہے۔ جسے آپ غلطی سے اقبال کی روح سمجھ بیٹھے ہیں۔"

پوری علیگڑھ یونیورسٹی کا جہاں اُس نے بی اے کیا، منظورِ نظر تھا۔ گرلز کالج میں ہر زبان پر اُس کے چرچے تھے۔ اُس کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ اُس کا قد کتنا اچھا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے، کسی سے محبت تو نہیں کرتا۔ یہ لڑکیوں کے محبوب موضوع تھے اور وہ اپنے قہقہوں، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور اُڑتے ہوئے دوپٹوں میں لہروں میں اُس کے شعر گنگنایا کرتی تھیں۔ لیکن لڑکیوں کا وہی محبوب شاعر جب ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے شائع ہونے والے رسالہ "آواز" کا ایڈیٹر ہو کر دلّی آیا تو یہاں ایک لڑکی ہی کی وجہ سے دل پر ایسا زخم کھایا کہ زندگی بھر مندمل نہ ہو سکا اور ایک برس بعد ہی ملازمت ترک کر کے جب وہ واپس اپنے وطن لکھنؤ کو لوٹا تو بقول اس کے عزیز و اقارب کے وہ عشق کی آگ میں بُری طرح جل رہا تھا۔ اور اُس نے بے تحاشہ پینا شروع کر دی تھی۔ اسی سلسلہ میں ۱۹۴۰ء میں اُس پر نروس بریک ڈاؤن کا پہلا حملہ ہوا اور یہ رٹ لگی کہ فلاں فلاں مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن رقیب روسیاہ زہر دینے کی فکر میں ہے۔ (یہاں ایک انکشاف بے محل نہ ہوگا کہ مجاز نے دلّی کے ایک چوٹی کے خاندان کی انتہائی خوبصورت اور اکلوتی بیٹی سے عشق کیا تھا۔ لیکن اُس کے بیاہتا ہونے کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور وہ کہتے ہوئے دلّی سے رخصت ہو گیا کہ:

رخصت اے دلّی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں۔ نالہ بہ لب جاتا ہوں میں

علاج معالجہ سے دماغی کیفیت درست ہوئی تو والدین نے دل کی چوٹ کا علاج کرنا چاہا، لڑکی! کوئی سی لڑکی جو اس کی زندگی کا سہارا بن سکے جو اسکے رستے ہوئے ناسور پر مرہم رکھ سکے۔ لیکن وہی لوگ جنہیں مجاز کو اپنا داماد بنانے کی

دیرینہ آرزو تھی عیب جوئی اور نکتہ چینی پر اُتر آئے اور خاندان کے اس محبوب نوجوان کا ذکر محض شرابی کی حیثیت میں ہونے لگا۔ مجاز نے نارمل زندگی بسر کرنے کی کوشش کی۔ کچھ دن بمبئی انفارمیشن میں کام کیا۔ وہاں سے واپس ہوا تو لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ اسی زمانہ میں سبط حسن اور سردار جعفری سے مل کر "نیا ادب" نامی ترقی پسند رسالہ کی ادارت کی۔ اور پھر ہارڈنگ لائبریری دِلّی میں بطور اسسٹنٹ لائبریرین کام کرنے لگا۔ لیکن اسی زمانہ میں بقول اس کی چھوٹی بہن حمیدہ سالم مجاز کے زخم پر ایک اور زخم لگا۔ والدین نے کسی طرح ایک رشتہ طے کیا۔ اور مجاز نے شاید خود سپردگی میں نجات پانے کے خیال سے حامی بھر دی۔ لیکن جب بر دکھوے کے طور پر اپنے سسر کے روبرو پیش ہوا تو ہزاروں روپیہ ماہوار کمانے والے سرکاری عہدہ دار کو ڈیڑھ سو روپلی پانے والے اسسٹنٹ لائبریرین میں کوئی کشش نظر نہ آئی۔ یہاں ایک بار پھر زر کی جیت ہوئی اور فن کی شکست۔۔ شاعر نے ایک بار دل کی آواز پر قدم اُٹھائے تھے اور منہ کے بل گرا تھا۔ اس بار عقل پر بھروسہ کیا تھا بڑے پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ لیکن پھر ٹھوکر کھا گیا۔ اور کھسیا کر رو پڑا۔ تدبیر کے پائے سنگین پر تقدیر نہ جھک سکی۔ اور مجاز پر ۱۹۴۵ء میں دیوانگی کا دوسرا حملہ ہوا۔ اب وہ خود ہی اپنی عظمت کے راگ گاتا تھا۔ شاعروں کے نام کی فہرست تیار کرتا تھا اور غالب اقبال کے بعد اپنا نام لکھ کر شجرہ ختم کر دیتا تھا۔ ڈاکٹروں کی کوششوں اور گھر والوں کی جان توڑ تیمارداری اور دلجوئی سے کسی طرح قابو میں تو آگیا۔ لیکن زندگی کا ڈھرہ نہ بدل سکا۔ مسلسل بیکاری اور تنہائی کا ساتھ رہا۔ شراب نوشی بڑھتی گئی زندگی میں تلخیاں بڑھتی اور وہ خود ہی ان تلخیوں کو شراب میں غرق کرنے کی ناکام کوشش

کرتے کرتے بالآخر خود ہی شراب میں غرق ہو گیا۔

جدید اُردو شاعری کا یہ محبوب لیکن حسرت انجام شاعر سنہ ۱۹۰۷ء میں اودھ کے ایک مشہور قصبہ ردولی میں پیدا ہوا۔ والد چودھری سراج الحق ردولی کے پہلے شخص تھے جنہوں نے زمیندار ہوتے ہوئے ایل ایل بی تک کی اعلےٰ تعلیم حاصل کی اور زمینداری پر سرکاری ملازمت کو ترجیح دی۔ یوں اسرار الحق (مجاز) نے اُس اُبھرتے ہوئے گھرانے میں پرورش پائی جو ایک طرف پُرانی قدروں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھا۔ اور دوسری طرف نئی قدروں کو بھی اپنا رہا تھا۔[۱]

بچپن میں جیسا کہ اُس کی بہن حمیدہ کا کہنا ہے۔" مجاز کی طبیعت میں بڑی معصومیت، اور سادگی تھی۔ جاگیردارانہ ماحول میں ملکیت کا احساس بچے کی گھٹی کے ساتھ سرایت کرتا ہے لیکن وہ فطرتاً بے خبر اور لاابالی تھا۔ دوسروں کی چیز اپنے تصرف میں لے آنا اور اپنی چیز دوسرے کو دے دینا اُس کی عادت رہی۔ اس کے علاوہ شروع سے حُسن پرست بھی تھا۔ کوئی خوبصورت عورت دیکھ لیتا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھا رہتا۔ کھیل کود، کھانے پینے کی کسی چیز کی سُدھ نہ رہتی۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے امین آباد ہائی اسکول میں پانے کے بعد وہ جب آگرہ کے سینٹ جانسن کالج میں داخل ہوا تو کالج میں معین احسن جذبی اور پڑوس میں فانی بدایونی کا ساتھ ملا اور یہیں سے مجاز کی اس تابناک شاعری کا آغاز ہوا جس کی چمک آگرہ اور علیگڈھ، دِلّی اور پھر سارے

---

[۱] اس خصوصیت کی جھلک مجاز کی شخصیت میں بھی تھی اور کلام میں بھی۔ اُس کا تمام تر کلام پُرانی بوتلوں میں نئی شراب کے مصداق ہے۔

ہندوستان میں پھیل گئی۔

مجاز کی شاعری کی ابتدار بالکل روائتی انداز سے ہوئی اور اُس نے اُردو شاعری کے عام مزاج کا ہمیشہ پاس رکھا۔ کہیں اوپر میں کہہ چکا ہوں کہ مجاز کو اختر شیرانی کی موت کا بے حد قلق تھا۔ اور عالم مدہوشی میں بھی وہ اُسے اُردو کا بہت بڑا شاعر گردان رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اختر شیرانی اور مجاز کی شاعری کا پس منظر ایک ہے۔ بنیادی طور پر دونوں رومانی شاعر ہیں۔ وہاں بھی بیکار زندگی کی افسردگی کا نکھار ہے اور یہاں بھی، وہاں بھی شراب ہے اور یہاں بھی۔ وہاں بھی کوئی نہ کوئی سلمٰی اور عذرا ہے اور یہاں بھی کوئی زہرہ جبیں۔ وہاں بھی غالب، مومن، حافظ اور خیام کا لب ولہجہ ہے اور یہاں بھی۔ لیکن آگے چل کر جو چیز مجاز کو اختر شیرانی سے الگ کرتی ہے وہ ہے مجاز کا ترقی پسندانہ رجحان۔ خالص عشقیہ شاعری کرتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی اور عام زندگی کے میلانات اور تاثرات سے پہلو تہی نہیں کرتا۔ حسن وعشق کی ایک الگ دُنیا بسانے کی خواہش کے برعکس وہ حسن وعشق پر عائد کردہ پابندیوں اور ماحول کی ناآسودگیوں کے خلاف اپنے غم وغصے کا اظہار کرتا ہے، آسمانی حوروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اُس کی نظر عام رہگذاروں کے گندے لیکن پُرکشش حسن پر پڑتی ہے۔ ان نظاروں کے مشاہدے کے بعد وہ عام انسانوں کی طرح زندگی کے دُکھ درد کے بارے میں سوچتا ہے اور پھر فنی نکھار کے ساتھ جو نظم کہتا ہے تو اس میں کسی زہرہ جبیں کے لئے محبت ہی نہیں ہوتی بلکہ بغاوت کی جھلک بھی ہوتی ہے۔ یہ بغاوت وہ کبھی موجودہ نظام سے کرتا ہے۔ کبھی سامراج سے۔ اور زندگی کی محرومیوں کے پیش نظر کبھی کبھی اس قدر تلخ ہو جاتا ہے کہ اپنی زہرہ جبینوں کے نگار خانے تک پاش پاش کر دینا چاہتا ہے۔

غالباً اسی لئے مجازؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے بزرگ شاعر اثرؔ لکھنوی نے ایک بار لکھا تھا کہ "اُردو میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا۔ لیکن انقلابی بھیڑیئے اُسے اُٹھا لے گئے"۔

مجازؔ کو انقلابی بھیڑیئے اٹھا لے گئے یا وہ خود میاتی ہوئی بھیڑوں کے گلے سے نکل آیا۔ اس بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اس حقیقت سے اُردو ادب کا کوئی قاری انکار نہیں کر سکتا کہ مجازؔ نے جس انداز سے انفرادی دکھوں کو سماجی پس منظر میں جانچا ہے اور حقیقت و رومان کا سنگم تلاش کیا ہے اور اُس کے یہاں جس خلوص اور سوز، محبت اور سیاست تغزل اور تفکر کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے، وہ اس کی فنی صلاحیتوں کے علاوہ اس امر کی بھی بین دلیل ہے۔ کہ کوئی ادیب یا شاعر محض خلا میں زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اپنے تخیل کے پروں پر اُڑ کر زیادہ دیر تک کسی مصنوعی جنت میں زندہ رہ سکتا ہے۔

۱۹۳۵ء میں جبکہ مجازؔ کو شعر کہتے ابھی صرف پانچ برس ہوئے تھے۔ اور ہندوستان میں ابھی اُردو کی ترقی پسند تحریک کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا مجازؔ نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا تھا۔

خوب پہچان لو اسرارؔ ہوں میں
جنسِ اُلفت کا طلبگار ہوں میں
خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد
اور اک شاعرِ بیدار ہوں میں
عیب جو حافظؔ و خیامؔ میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

ہر چند کہ وہ حافظ و خیام کے عیب کا گنہگار تھا۔ لیکن نوعِ انساں کی پرستش کا یہی جذبہ ہر موقع پر اس کی مدد کرتا رہا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ اپنی رندی و سرمستی اور محویتِ مہِ درخشاں کے باوجود اور بنیادی طور پر رومانی شاعر ہوتے ہوئے بھی اگر ہر قدم پر نہیں تو ہر موڑ پر وہ ضرور زندگی کی ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ میرے اس دعوے کے ثبوت میں مجاز کے حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جنہیں میں بالترتیب اور تاریخ وار پیش کر رہا ہوں۔

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

۱۹۳۶ء

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں میں نورِ ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے، اہرمن محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

۱۹۳۷ء

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان و جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

۱۹۳۷ء

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کی ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب اس طرف دیکھا تو ہے

سنہ ۱۹۳۹ء

بول ری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

سنہ ۱۹۴۵ء

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں

سنہ ۱۹۴۷ء

سبزۂ و برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا
سارا چمن اداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا
کوئی بتائے عظمتِ خاکِ وطن کو کیا ہوا
کوئی بتائے غیرتِ اہلِ وطن کو کیا ہوا

سنہ ۵۰ء

ان اشعار میں ہمیں جنتا کی بیداری' آزادی کی تحریک'
عوامی تحریک میں فن کاروں کی ذمہ داری' آزادی اور آزادی کا ردِ عمل
وغیرہ ہر چیز کی جھلکیاں ملتی ہیں جھلکیاں ہیں اس لئے کہہ رہا ہوں کیوں کہ
مجاز نے چاہے کتنا ہی بڑا اور کیسا ہی موضوع کیوں نہ پیش کیا شعری

نقاصنوں کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور چونکہ اس کا اندازِ نظر رومانی تھا۔ اور اُس کا جمالیاتی ذوق ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا تھا اور اُس نے کلاسیکی شاعری سے انحراف کرنے کی بجائے پُرانی تشبیہوں، استعاروں اور الفاظ کو نئے معانی پہنانے کی کوشش کی تھی اس لئے بعض جگہوں کو چھوڑ کر جہاں سماجی اور معاشی بدعنوانیوں کے شدید احساس سے وہ کچھ جذباتی اور تخریب پسند ہو گیا ہے، مجموعی طور پر وہ سماجی اور معاشرتی انقلاب کے لئے گرجتا نہیں گاتا ہے اور میری نظر میں اُس کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔

مجاز کے مجموعۂ کلام "آہنگ" کے دیباچہ میں فیض احمد فیض نے بھی اُسے "انقلابی ڈھنڈورچی" کے بجائے "انقلاب کے مطرب" کے خطاب دیتے ہوئے بالکل ٹھیک لکھا تھا کہ

"...... مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے
عام انقلابی شاعر انقلاب سے متعلق گرجتے ہیں للکارتے ہیں
سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب سے متعلق گا نہیں سکتے ...... وہ صرف
انقلاب کی ہولناکی نو دیکھتے ہیں اُس کے حسن کو نہیں پہچانتے۔
یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے ...."

"مجاز اُردو شاعری کا کیٹس تھا۔"

"مجاز صحیح ترقی پسند شاعر تھا۔"

"مجاز جمالیات اور خمریات کا شاعر تھا۔"

"مجاز اچھا شاعر اور گھٹیا شرابی تھا۔"

"مجاز نیم دیوانہ لیکن پُرخلوص انسان تھا۔"

"مجاز بذلہ سنج اور لطیفہ گو تھا۔"

مجاز کو پڑھنے والے، مجاز سے ملنے والے، مجاز کو جاننے والے گھوم پھر کر آرار کے انہیں نقطوں پر پہنچتے ہیں لیکن یہی نقطے مل جل کر ایک ایسے درخشاں مرکز پر آ ملتے ہیں جہاں صرف مجاز اور مجاز لکھا ہوا ہے ــــــ!

پرکاش پنڈت
یکم اگست ۱۹۶۳ء

★

جگن بھیّا

مجازؔ میرا بھائی ایک ڈرامائی انداز سے اس زندگی میں ابھرا اور اسی انداز سے ڈوب گیا۔ اُس کی زندگی امنگوں حوصلوں سے بھرپور شروع ہوئی اور محرومیوں، مایوسیوں میں گھِر کر ختم ہوگئی۔ وہ زندگی کو روشن سے روشن تر دیکھنے کی تمنائیں پالتا رہا۔ اور اُس کی اپنی زندگی دھیرے دھیرے تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی۔ اُس نے زندگی کو اپنی تخلیقی قوتوں کا سرمایہ سونپا۔ اپنی شاعری دی جس میں کائنات کو حسین بنانے کے حوصلے ہیں۔ مستقبل کو سنوارنے کی امنگیں ہیں۔ جوانی کی جولانی ہے، تجربہ کی ہوشمندی ہے۔ شوریدہ سری ہے، حُسن ہے۔ نفاست ہے، سادگی ہے، پُرکاری ہے۔ اور زندگی نے اُسے پریشانیاں دیں پشیمانیاں دیں۔ الجھنیں دیں، بے چینی دی۔ وہ زندگی سے محبت مانگتا رہا۔ مسرت مانگتا رہا۔ سکون چاہتا رہا۔ آسودگی چاہتا رہا۔ اور زندگی رفتہ رفتہ اس سے دور کھنچتی رہی۔ یہاں تک کہ زندگی کی کھیتی کو خونِ دل سے سینچنے والے

شاعر کو موت کی آغوش میں پناہ ملی۔

مجاز کی زندگی اور مجاز کی شخصیت کی کمزوریوں اور خوبصورتی کو سمجھنے کیلئے اس پس منظر سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے۔ جس کے ساتھ مجاز کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ مجاز اودھ کے ایک مشہور قصبہ ردولی کے ایک کھاتے پیتے خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان اور قصبہ جس میں مجاز نے جنم لیا۔ دونوں ہی کچھ اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ زمینداری کے خاتمہ سے پہلے ردولی کی تمامتر آبادی زمینداروں اور تعلقہ داروں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے ماحول میں جاگیردارانہ نظام کی تمام خوبیاں اور خامیاں سمٹی ہوئی تھیں۔ بظاہر وہاں کا کلچر اور تہذیب کی سطح بلند تھی۔ وہاں کی زندگی میں سلیقہ تھا، خوش مذاقی تھی۔ لوگ اچھا کھاتے تھے۔ اچھا پہنتے تھے۔ رکھ رکھاؤ میں وضعداری میں، خاطر تواضع میں یقین رکھتے تھے۔ پرانی روایتوں سے آخر دم تک چمٹے رہنے میں اعتقاد تھا۔ رسم و رواج کی پابندی ایمان تھا۔ دکھاوے اور نمائش کو اہمیت حاصل تھی۔ ہر خوشی اور غم کے موقع پر دھوم دھام کی تقریبیں ضروری تھیں۔ ہر تہوار پر برادری بھر میں حصے بانٹنے لازمی تھے۔ یہ ڈھانچہ زمینداری کی کمزور بنیادوں پر کب تک کھڑا رہتا، آخر کو بیٹھ گیا۔ اور آج ردولی میں سوائے عمارتوں کے کھنڈر اور افسردہ و اداس چہروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مجاز کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اپنے بچپن کی ہر یاد انہیں بہت عزیز تھی۔ اس خود فراموشی کے عالم میں جب کبھی اماں اُن کی بچپن کی ردولی کا ذکر چھیڑتیں تو وہ بہت دلچسپی سے اُس میں حصہ لیتے۔ ہر چھوٹے بڑے کو پوچھتے۔ اب سے آٹھ دس سال پہلے تک وہ اکثر ردولی جایا کرتے تھے۔ لیکن اب باوجود اصرار کے بھی وہ وہاں نہیں جاتے تھے۔ اُنہیں اپنے وطن کے زوال پر بہت دکھ تھا۔

ہمارے دادا چودھری احمد حسین گو کہ تھے متوسط درجہ کے زمیندار لیکن اپنی سمجھ بوجھ اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے قصبہ بھر میں مشہور تھے، اُن کے سات اولادیں تھیں، چار بیٹے تین بیٹیاں۔ سب کے سب ذہین، ہوشیار۔ یہاں تک کہ معاملہ فہمی، کارگزاری میں اس خاندان کی بیٹیاں اس قدر مشہور تھیں کہ قصبہ میں اب تک اُن کی مثال دی جاتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا سوال تھا مسجد کے مکتب تھے، اور کھاتا پیتا خاندان گھر میں مولوی رکھتا تھا۔ غرضیکہ عربی فارسی کی تعلیم اور حساب سے اتنی واقفیت کہ زمینداری کا پیشہ کامیابی سے چلایا جا سکے۔ یہ تھا معیار۔ دادا کی دو اولادیں بچپن ہی سے کچھ مختلف اور ذرا غیر معمولی سی طبیعتیں رکھتی تھیں۔ ایک تو میرے چچا بے حبر، مدہوش، رنگین مزاج اور آزاد منش، دوسرے میرے والد سنجیدہ، بردبار۔ کم سخن، محنتی، مرنجان مرنج قسم کے انسان، طبیعت پر تصوف پرستی کا رنگ غالب، دادا کو ان دونوں ہی کی طرف سے پریشانی تھی۔ چچا تو قابو میں نہ آ سکے، باپ کی زندگی چھپ چھپ کر بعد میں کھلم کھلا جائداد کی پائی پائی بیچ کر خوب رنگ رلیاں منائیں۔ میرے والد دُنیا کے بکھیڑوں میں پھنسا دیے گئے۔ چودہ برس کی عمر میں چچا زاد بہن سے شادی کی گئی۔ لیکن اُن کی علم دوستی میں فرق نہ آیا۔ اتفاقاً اسی زمانے میں ایک تعلقدار گھرانے میں فیض آباد سے آئے ہوئے ایک بڑے انگریزی داں اُستاد رکھے گئے۔ والد نے اُن سے استفادہ کیا اور زیادہ تر اپنی لگن کی وجہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ قصبہ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ دادا کی بھی ہمت بڑھی۔ والد لکھنؤ بھیجے گئے۔ اور کچھ اپنی کاوش اور کچھ گھر والوں کی مدد سے تعلیم کا انتظام ہوا۔ بی اے ایل ایل بی تک نوبت آئی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کی نوبت آئی۔ ردولی کے یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے زمینداری

کے باوجود کسی دوسرے پیشے کو اپنایا۔ غرضکہ مجاز اس ابھرتے ہوئے خاندان میں پیدا ہوئے جو ایک طرف تو پرانی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھا دوسری طرف نئی قدروں کو بھی اپنا رہا تھا۔ اس خصوصیت کی ایک جھلک مجاز کی شخصیت میں بھی تھی اور کلام میں بھی۔ ہماری ماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بالکل ان پڑھ، تیز، ذہین، زمانہ شناس، فطرتاً شوقین مزاج، تفریح پسند، طبیعت پر جذباتیت کا رنگ غالب۔ مجاز کی شخصیت میں ماں باپ دونوں دونوں کا ملا جلا رنگ تھا، باپ کی طرف سے نیک نیتی، کم سخنی حقیقت پسندی اور طبیعت کی گہرائی پائی۔ ماں کی طرف سے طبیعت میں حسن پرستی، زود حسی، اثر پذیری اور جذباتیت ملی۔ کاش اُن کے حصے میں باپ کی طبیعت کا ٹھہراؤ، استقلال اور ارادے کی مضبوطی اور عاقبت اندیشی ملی ہوتی۔ لیکن اُن کی زندگی کو تو بکھرنا تھا۔ زمانہ کو تو حالات کے ہاتھوں فنکار کی موت کے تماشے دیکھنے تھے۔ اُن کی طبیعت میں وہ مضبوطی نہ تھی۔ جو اُن کے دل و دماغ کی نزاکت کو ڈھال بن کر محفوظ رکھ سکتی۔

مجاز اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مبارک سلامت کی صداؤں کے درمیان پیدا ہوئے۔ اُن سے بڑا ایک بچہ ڈھائی سال کی عمر میں فوت ہو چکا تھا۔ اس لئے بہت لاڈ اور منت مرادوں سے پالے گئے۔ محرم کی ساتویں کو فقیر بننے دسویں کو پائیک بنائے جاتے۔ ایک کان میں مُندا پڑا ہوا تھا، جو چھ سال کی عمر میں اجمیر لے جا کر اتارا گیا۔ ہر دکھ بیماری پر صدقے اترتے، خیراتیں ہوتیں، نو دس سال کے تھے کہ اٹھارہ سالہ بڑے بھائی کا درخت سے گر کر انتقال ہو گیا۔ پھر کیا تھا، ماں اور نانی دیوانہ وار اُن کو تمام حوادث خطرات سے بچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگ گئیں۔ مجال نہ تھی کہ اکیلے گھر سے باہر قدم

نکالیں۔ ہر وقت ایک نوکر اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ عمر کے آٹھ حصے تک کوئی صبح ایسی نہ گزری جب ماں نے اُن کی زندگی کیلئے دو رکعت شکرانہ کی ادا نہ کی ہوں۔ اب سے کچھ ہی سال پہلے تک روزانہ رات کو اُن کے سرہانے دو آنے رکھے جاتے جو صبح خیرات کر دیے جاتے۔ غرضیکہ ہر سانس کے ساتھ ماں کی دُعائیں وابستہ تھیں اور ہر قدم کے ساتھ حسرتیں اور آرزوئیں۔ بچپن سے ہم سب نے یہ محسوس کیا کہ گویا ماں کی زندگی کا محور وہی ہوں۔ ان حالات میں ہم بھائی بہنوں کے دل میں اُن کے طرف سے رقابت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری تھا۔ لیکن یہ اُن کی اپنی طبیعت کی سادگی، معصومیت اور خلوص تھا جو ایسی بدمزگی کی فضا گھر میں کبھی پیدا نہ ہوئی، ماں نے اُن کی پرورش میں کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں اور آنے والی مسرتوں کے خواب دیکھے ہیں اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اُن کی عرفیت جگن اسی بنا پر پڑی کہ بچپن سے راتوں کو جاگنے کی عادت تھی۔ کسے معلوم تھا کہ بچپن کی یہ شب بیداری اور بے چینی آخر عمر تک اُن کا ساتھ دے گی۔

جگن بھیا بچپن کے بلا کے شریر اور بے خبر تھے۔ بہنوں کو چھیڑنا۔ بھائی سے لڑنا۔ سب کے مٹھائی کے حصے چُپ چُھپا کر کھا لینا۔ کھلونوں کو توڑ پھوڑ کر اُن کے اندر کی ماہیت معلوم کرنا۔ گلی ڈنڈا، اور ڈھول دھپّا، یہ تھے اُن کے محبوب مشغلے۔ آپا، میری بڑی بہن اُن سے بہت بڑی تھیں، سو اُن سے ڈرتے تھے اور اُن کے رعب میں رہتے تھے، اُن کا برتاؤ بھی اُن سے بہن سے زیادہ ماں کا سا تھا۔ صفیہ آپا اور انصار بھائی سے اُن کا اوپر تلے کا سا معاملہ تھا۔ بچپن میں ان تینوں کی ایک منٹ نہ بنی۔ صفیہ آپا کی گڑیوں کی چٹیا پکڑ کر نچانے میں اُن کو خاص لطف ملتا تھا۔ غرضیکہ ہر وقت اُن تینوں کے مقدمے پیش ہوتے رہتے تھے۔ پر فیصلہ زیادہ تر جگن بھیا ہی کے حق میں ہوتا تھا۔ کیونکہ

..... ابّا کے علاوہ کوئی بھی تو غیر جانبدارانہ طور پر فیصلہ نہیں دتیا تھا۔ جگن بھیا سب ہی کے لاڈلے تھے اور ابّا ملازمت کے سلسلہ میں زیادہ تر لکھنؤ رہتے تھے۔ جب تعطیلوں میں آتے تو جگن بھیا کا رنگ ہی بدلا ہوا ہوتا۔ ابّا کا ایک حد تک روایتی ادب انھوں نے اپنی عمر کے آخری لمحہ تک کیا۔ دیوانگی کے دور بھی گذرے لیکن ابّا کے سامنے اُنھوں نے کبھی سگریٹ نہ پی۔ یہاں تک کہ اُن کے سامنے کبھی کلام بھی نہیں سناتے تھے۔ میں اُن سے بہت چھوٹی تھی میری طرف اُن کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ مجھے بہت چاہتے تھے، دوسروں کی مٹھائی چراتے اور مجھے کھلاتے، میری پرورش میں ماں کا ہاتھ بٹاتے۔ ماں کے بعد میں اُن سے ہی مانوس تھی۔ ہر وقت اُن سے چمٹی رہتی۔ میرا نام بھی اُن ہی کا رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ ہے جگن بھیا بچپن ہی سے بہت حُسن پرست تھے کوئی خوبصورت بیوی دیکھ لیتے بس دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھے رہتے۔ کھیل کود، کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک خوبصورت دولہن بیاہ کر ردولی آئیں، اُن کا نام حمیدہ تھا۔ ان کے پیچھے جگن بھیا کا دیوانگی کا عالم تھا۔ میرا نام ذکیہ رکھا گیا تھا۔ ضد کر کے بدلا اور حمیدہ رکھ دیا۔ جانے محض چاہت میں یا اس اُمید میں کہ شاید نام ہی کی لاج رکھ میں خوبصورت نکل جاؤں بڑھ کر۔ میں اکثر اُن سے لڑتی تھی کہ چہرہ کی خوبصورتی الگ رہی، مجھے نام کی خوبصورتی سے بھی محروم کر ڈالا۔ گھسا پٹا نام رکھ دیا۔ ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ ارے پگلی خوبصورتی کہیں ناک آنکھ کی ہوتی ہے۔ اصل خوبصورتی تو دل کی ہوتی ہے جو چہرہ پر دمکتی ہے۔ میں پانچ سال کی تھی کہ مجھے چیچک نکلی اور اس غضب کی کہ سارا جسم دانوں سے لد گیا۔ ایسے عالم میں جو گھناؤنا عالم رہا

ہو گا۔ اس کا اندازہ ہو ہی سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دور سے بو آتی تھی۔ ابا نے احتیاطاً سب بچوں کا میرے پاس آنا بند کر دیا تھا۔ لیکن جگن بھیا چھپ چھپ کر میرے پاس پہنچ جاتے۔ میرے دانوں پر نیم کی ٹہنیوں سے کھجلی کرتے۔ مجھے کہانیاں سناتے، لطیفے سناتے۔ آخر کو انہیں منع کرنا ہی چھوڑ دیا گیا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ ان کے دل میں کتنی نرمی تھی۔ کیسا گداز تھا۔ طبیعت میں کتنا خلوص تھا۔ کیسی ہمدردی تھی جو وہ میرے گھناؤنے قرب کو اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر ترجیح دے پاتے تھے۔ ویسے بھی بیماروں کی تیمارداری کا ان میں بڑا ہنر تھا۔ ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا تو دوا پلانے کی ذمہ داری انہیں کے سر ہوتی۔ اور خاندان کا یہ بے خبر اور لاابالی بچہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو پوری کامیابی کے ساتھ سنبھالتا۔

جگن بھیا کی طبیعت میں بچپن ہی سے ایک قسم کی معصومیت اور سادگی تھی جس کی وجہ سے وہ سب کو عزیز تھے۔ جاگیردارانہ ماحول میں ملکیت کا احساس بچہ کی گھٹی کے ساتھ سرایت کرتا ہے۔ لیکن وہ فطرتاً بے خبر اور لاابالی تھے۔ دوسروں کی چیز اپنے تصرف میں لے آنا اور اپنی چیز دوسروں کو دیدینا ان کی عادت رہی۔ گھر کے نوکروں چاکروں سے ان کے بھائی برادری کے تعلقات تھے۔ ایک گھر کے پلے ہوئے نوکر شرف الدین سے ان کی بہت گہری چھٹتی تھی۔ وہ ان کے گلی ڈنڈے کا ساتھی تھا۔ جوان ہو کر اس نے دوسری جگہ نوکریاں کیں لیکن وہ اکثر بڑے بھیا سے ملنے آیا تھا۔ غرضکہ بچپن ہی سے وہ کچھ غیر معمولی تھے۔ ایک کان کچھ خراب رہتا تھا۔ اس لیے ذرا اونچا سنتے تھے۔ میرے ایک ماموں انہیں "بہرے او" کہتے تھے۔ ایک چچا انہیں "سڑے اُد" کہتے تھے۔ اور کچھ سنکی۔ یہ نام سولہ سترہ برس کی عمر تک رائج رہے۔ یہاں تک کہ

ماں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ اب لڑکا جوان ہوا ہے اُسے سڑی سنکی کہنا مناسب نہیں۔

شوخ، شریر اور بے خبر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین تھے۔ پڑھائی میں ہوشیار اور حساب میں خاص طور پر بہت تیز تھے۔ جماعت میں ہمیشہ اچھے طالب علموں میں شمار رہا۔ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ کھیل کود کی وجہ سے گھٹنے ہمیشہ زخمی رہتے تھے۔ اور اماں بے چاری نئے نئے پاجاموں میں پیوند لگاتے لگاتے اور رفو کرتے کرتے عاجز آ گئی تھیں۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی ہمیشہ مشق ہوتی رہتی تھی۔ گھر کے نہ جانے کتنے پلنگ اُن کی اس مشق کی نذر ہو ہو گئے۔ پلنگ کھڑے کر کر کے اُن پر سے کودتے تھے۔ غرض کہ گھر میں ہم سب کے لئے ہر وہ وہ تفریح اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتے رہتے۔

پڑھائی میں ہوشیار ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کا بھی سلیقہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کی تعلیم میں اُنہوں نے بہت دلچسپی لی۔ صفیہ آپا کو انگریزی اُنہوں نے ہی شروع کروائی۔ میری تو درس تدریس کی تمام ذمہ داری اُنہیں کے سر تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کی یاد کا نقش میرے ذہن پر بہت گہرا ہے۔ پڑھنے میں میرا دل بالکل نہ لگتا تھا۔ نہ جانے کتنے قاعدے میرے لئے آئے ہوں گے اور میں از یر آ اور ب زبر با سے آگے نہ پڑھ سکی۔ جانے میں غائب کر دیتی تھی یا غائب ہو جاتے تھے۔ میری تمام دلچسپی گڑیوں، ہنڈکلھیوں، یا پھر سہیلیوں کے ساتھ محلہ بھر میں گھومتے میں تھی۔ ایک دن اُستانی جی نے مایوس ہو کر ماں سے میری شکایت کر دی۔ ماں نے مجھے بلا کر بہت ہی رقت آمیز لہجہ میں سمجھایا کہ نہ میری شکل، نہ صورت آخر پڑھوں گی نہیں تو پھر کہاں کھپوں گی۔ تصور بہت خوفناک تھا۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ جگن بھیا اس منظر سے بہت متاثر ہوئے، فوراً اُٹھے اور ردی

کے صندوق سے ایک بادامی رنگ کا قاعدہ نکال کر لائے استانی جی سے میرا پڑھنا ختم کرادیا اور مجھے خود پڑھانا شروع کر دیا۔ اس دن سے میں چل نکلا۔ کہہ نہیں سکتی کہ اُن کے پڑھانے کا ڈھنگ تھا یا ہم دونوں کے درمیان کا جذباتی بندھن بہرحال وجہ کچھ بھی ہو اُس دن سے پڑھائی میں بددلی اور بدشوقی ختم ہو گئی جس وقت تک میرا اسکول میں داخلہ نہ ہوا وہی مجھے پڑھاتے رہے۔ اُردو، انگریزی، حساب سب ہی کچھ اُن کی ذمہ داری تھی۔ چھوٹے موٹے مضمون لکھواتے اور سب کے سامنے پڑھوا کر سُنتے اور بہت خوش ہوتے۔ لیکن اُسے بھی فطرت کی ستم ظریفی ہی سمجھئے، میرا رجحان اُن کے مذاق کے بالکل برعکس رہا۔ بی اے کے بعد اُن کا اصرار تھا کہ میں اُردو لوں لیکن مجھے اپنے ادبی ذوق کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ سو میں نے معاشیات کا انتخاب کیا۔ جگن بھیا کو اُس وقت مجھ سے خاصی مایوسی ہوئی۔

غرضیکہ جگن بھیا نے جب بچپن سے جوانی میں قدم رکھا۔ اُن کا شمار ہونہار نوجوانوں میں ہوا۔ جائداد تھی، گھر تھا۔ باپ سرکاری ملازم تھے۔ شکل و صورت تھی صحت تھی۔ کیا کمی تھی۔ ہر لڑکی والے کی نظر اُن پر تھی۔ شادی کی باتیں شروع ہوئیں۔ نانی کی خواہش تھی کہ دولہن کم عمر ہو۔ ماں کی تمنا تھی کہ بہو خوبصورت ہو۔ بہنوں کی آرزو تھی کہ بھاوج پڑھی لکھی ہو۔ باپ نے کہا کہ جب تک بیٹا تعلیم ختم کر کے اپنے پاؤں پر نہ کھڑا ہو شادی کا کوئی سوال نہیں، ماں اور نانی دل مسوس کر چپ ہوتیں۔ بہنوں نے باپ کی بات کا وزن محسوس کیا اور معاملہ دب گیا۔ جن لوگوں کے دلوں میں جگن بھیا کو داماد بنانے کی آرزو تھی اُن کے دلوں میں رنجش نے جگہ لے لی، رویہ اور رجحان بدلنے لگے۔

جگن بھیا کی رنگین مزاجی، ہم عمر لڑکیوں اور بھاوجوں سے چھیڑ چھاڑ جو اُن کے حسنِ اخلاق کی دلیل سمجھی جاتی تھی، اب اُن کی آوارگی کی دلیل سمجھی جانے لگی۔ اُن کے

لاابالی پن کا جو اُن کی معصومیت کا ثبوت سمجھی جاتی تھی غیر ذمہ داری میں شمار ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے عیب جوئی اور نکتہ چینی کیلئے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہوتا گیا اور خاندان کا یہ محبوب نوجوان محض شرابی کی صورت اختیار کر کے رہ گیا۔

جگن بھیا کی بالکل ابتدائی تعلیم ردولی کے ایک مکتب میں ہوئی۔ میٹرک اُنہوں نے امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ سے کیا۔ اُسی زمانہ میں ابا کا تبادلہ آگرہ کا ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء میں سینٹ جانس کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ انجینئرنگ کی لائن اختیار کرنے کے خیال سے ریاضی کا مضامین میں انتخاب ہوا۔ آگرہ میں پڑوس فانی کا ملا۔ اور کالج میں جذبی بھائی کا ساتھ ہوا۔ طبیعت کا فطری رجحان جو اب تک اپنے کمرے کو پھولوں کے گلدان سے سجا کر رکھنے بچوں کو ڈرائنگ بنا کر دینے، دیوالی پر میرے لئے گھروندا سجانے اور اچھی اچھی تصویریں دیکھ کر خوش ہونے پر مطمئن تھا۔ اُبھرا اور اپنا صحیح راستہ ڈھونڈھنے پر مائل ہوا۔ شاعری کا دور شروع ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں ہم لوگ اُنہیں بورڈنگ میں چھوڑ کر علیگڈھ آگئے۔ یہاں سے اُن کی زندگی کا پہلا موڑ شروع ہوا۔ وہ خود بھی اس موڑ پر کچھ وقفہ پریشان اور ٹھٹھک کر رہ گئے۔ پڑھائی میں ابتری پیدا ہونا شروع ہوئی زندگی کا نظام درہم برہم ہونا شروع ہوا۔ امتحان میں فیل ہوئے۔ خود بتاتے تھے کہ امتحان کی کاپیاں بالکل سادی چھوڑ آتے تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ صبح کو پرچہ کیونکر حل ہوتا۔ وہ بھی حساب کا، کیمسٹری کا۔ گھر والے پریشان ہو اٹھے، اُنہیں علی گڈھ لے آئے۔ مضامین بدلے گئے فلسفہ، معاشیات اور اُردو کا انتخاب ہوا۔ دو سال حاضریاں پوری نہ ہو سکنے کے سبب امتحان نہ دے سکے۔ اللہ اللہ کر کے ۱۹۳۵ء میں بی اے

کیا۔ ایم اے میں داخلہ لیا۔ پرانی روایتوں کے خلاف پرویس کے اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میگزین کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ داخلہ کے ایک دو مہینے بعد دلی ریڈیو اسٹیشن سے "آواز" کی سب ایڈیٹری کی جگہ نکلی۔ بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ جگہ اچھی ہے، مذاق کے مطابق ہے۔ موقعے بار بار نہیں آتے۔ درخواست دی اور لے لئے گئے۔ علی گڈھ کا دور جگن بھیا کی ادبی زندگی اور سیاسی وسماجی شعور کا روشن ترین دور ہے۔ زیادہ تر اچھی نظمیں اسی زمانہ میں کہیں۔ سردار بھائی بسیط بھائی۔ بھائی اختر اور جگن بھائی کا ایک گروپ تھا۔ یہ سب نام ایسے ہیں کہ علی گڈھ یونیورسٹی کی تاریخ انہیں بھلا نہیں سکتی کوئی اچھا مقرر تھا تو کوئی چوٹی کا ادیب تو کوئی محبوب شاعر۔ سب اپنے اپنے ہتھیاروں سے فرسودہ نظام سے لڑ رہے تھے اور نئی قدروں کو زندہ رکھنے میں منہمک تھے علی گڈھ میں ایک نیا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ ایک نئی زندگی ابھر رہی تھی۔ لیکن مقرر کبھی کبھی اپنی زبان درازی سے دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے ادیب کے قلم کی تیزی کبھی کبھی کھٹکنے لگتی ہے۔ لیکن شاعر۔۔۔! وہ تو دلوں کا راز داں ہوتا ہے۔ وہ تو روح کا پیامبر ہوتا ہے اس کی بولی میٹھی ہوتی ہے، اس کا پیام سچا ہوتا ہے۔ پھر مجاز! جس کے یہاں شمشیر کی صلابت اور ساز وجام کا گداز، دونوں ہی ہیں۔ جس کے دل میں باغی کی آگ۔ جس کی رگوں میں جوانی کا جوش۔ جس کے گلے میں نغمہ سنجی کا وفور تھا۔ جس نے انقلاب کے نعرے لگانے کی بجائے انقلاب کے راگ گائے۔ جس نے علی گڈھ کو اپنا چمن قرار دیا۔ ایسا چمن جہاں:

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے۔ پھولوں سے جوانی ابلتی ہے

تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں

یہ بلبل اپنے چمن میں سب ہی کو عزیز تھا۔ استادوں کا منظورِ نظر۔ طلبار کیلئے مایۂ ناز۔ عورت کو نکتہ داں بنانے والا شاعر۔ لڑکیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گرلس کالج میں ہر زبان پر اس بلبل کے راگ تھے۔ مجاز کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ اس کا قد کتنا اچھا ہے، وہ کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کسی سے محبت تو نہیں کرتا۔ یہ لڑکیوں کے محبوب موضوع تھے۔

جگن بھیا سنہ ۱۹۳۶ء میں دہلی گئے۔ اور تقریباً ایک سال تک "آواز" کی سب ایڈیٹری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ملازمت کے زمانہ میں گھر کا ایک پرانا ملازم عاشق علی ان کے ساتھ تھا جو سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ پہلی کو تنخواہ اس کے حوالے کرتے اور پلٹ کر نہ پوچھتے کہ کب اور کیسے صرف ہوئی۔ ان کا گھر مہمانوں اور ٹھہرنے والوں کی وجہ سے ہمیشہ کیمپوں کی شکل اختیار کئے رہتا۔ گھرداری کے سلسلہ میں جتنی بھی چیزیں خریدیں سب میں خوش مذاقی کا لحاظ ضرور رکھتے۔

شاعر ہونے کی حیثیت سے شراب کی عادت تھی ہی۔ ریڈیو اسٹیشن کے ماحول میں اور بھی چمکی۔ لیکن اس وقت تک مجاز "شاعرِ محفل وفا مطربِ بزمِ دلبراں" تھا۔ اس کی زندگی "غرقِ شرابِ تیز و تند" نہ ہوئی تھی۔ وہ آنک علی گڑھ کا شاعر تھا۔ دِلّی کا شرابی نہ تھا۔ بہرحال ریڈیو اسٹیشن کی اندرونی پالٹکس اور یوپی اور پنجاب والوں کی رسّہ کشی نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ جگن بھیا ملازمت ترک کر کے یہ کہتے ہوئے دِلّی سے رخصت ہوئے:

رخصت اے دلّی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں، نالہ بہ لب جاتا ہوں میں
جاتے جاتے تجھ سے اک پیماں کیے جاتا ہوں میں
اپنے عزمِ سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
تیری اس بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور باندازِ دگر آؤں گا میں

ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے اس مختصر سے عرصہ میں ماں بہنیں چاند سی دولہن لانے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں۔ تلاش جاری تھی، انتظامات ہو رہے تھے، یہاں تک نائنوں، مراثنوں کے جوڑوں، پرجوں کے لئے لہنگے، کرتیاں پاسیوں کے لئے شال دوشالے خریدے گئے تھے۔ اور بس۔ صرف چاند سی دولہن کا انتظار تھا۔ کسے معلوم تھا کہ جگن بھیا کی زندگی کا یہ افق ہمیشہ ہی ابر آلود رہے گا۔ یہ چاند کبھی نہ نکلے گا۔ ماں کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔ بہنوں کی آرزوئیں کبھی بر نہ آئیں گی۔ انسان کی ضرورت تشنہ ہی رہے گی شاعر کا تصوّر کاغذی ہی پیکر پہنے رہے گا۔ جگن بھیا وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے تھے۔ شاعر سے عقیدت رکھی جا سکتی ہے، بہت سے بہت محبت کی جا سکتی ہے، پر شادی تو نہیں۔ پیٹ روٹیوں سے بھرتا ہے اشعار سے تو نہیں۔

دلّی کے قیام کے دوران جگن بھیا کے دل نے ایک ایسی چوٹ کھائی جس کا زخم زندگی میں کبھی نہ بھر سکا۔ مرہم اور پھاہے کا ذکر کیا۔ اُس پر مزید چوٹیں لگتی رہیں اور دھیرے دھیرے اُن کا پورا وجود ایک ناسور بن کر رہ گیا۔ اُن کے اپنے لئے، گھر والوں کے لئے اور سماج کے لئے، انہوں نے محبت

کی' ایسی گہری' ایسی پائیدار کہ آخر لمحہ تک اُن کے دم کے ساتھ رہی۔ لیکن قسمت دیکھو تو ہاتھ بھی بڑھایا تو شجر ممنوعہ کی طرف ــــ دِلّی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی چنچل' البیلی اور خوبصورت۔ لاڈ پیار میں پلی ہوئی عیش و عشرت کی عادی' ایک عدد بھاری بھرکم شوہر کی ملکیت یا مالک جو بھی سمجھ لیجئے یہ بیل منڈھے چڑھتی تو کیونکر۔ لیکن شاعر قدموں پر موتی بکھیرتا رہے۔ سر پر پھولوں کی بارش کرتا رہے اور بدلے میں چند مسکراہٹوں کا طالب ہو تو سودا مہنگا تو نہیں۔ شاعر بھی اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ:

میرا نغمہ باعثِ دلداریِ خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہ نشاطِ جاں تو ہے

لیکن بُرا ہو اس سماج کا' اس کی ٹیڑھی ترچھی سخت نگاہوں کا۔ اس کی انگشت نمائی کا۔ ہر کھیل بگڑ کر رہ جاتا ہے' انسان کی آہ کا ذکر کیا' شاعر کی واہ بھی خطرے میں پڑ گئی۔ غریب انسان کا کہتا کیا گھٹ کر رہ گیا۔ بے چارے شاعر کا دل ٹوٹ گیا۔

یاس کا دھواں اُٹھا ہر نوائے خستہ ہے
آہ کی صدا نکلی' ہر بربط شکستہ ہے

بظاہر تو اتنا ہی ہوا۔ لیکن قریب سے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کا پورا وجود سلگ کر رہ گیا اور سلگتے سلگتے سنہ ۱۹۴۰ء میں یہ آتش فشاں پھوٹ ہی نکلا۔ نروس بریک ڈاؤن کا یہ حملہ تھا۔ آج بھی مجھے وہ دن یاد ہیں۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھی۔ اور لکھنؤ ہی میں تھی۔ صبح سے شام تک اخبار سنانے سناتے یا شیلے اور کیٹس کے مجموعے سُناتے سُناتے میری زبان خشک ہو جاتی تھی' ایک لمحہ کی خاموشی گوارا نہ تھی۔ ایسا لگتا جیسے اندر شعلے اُٹھ رہے ہیں

جنہیں باتوں کے چھینٹوں سے بچانے کی کوشش ہو۔ بس یہ خبط تھا کہ فلاں مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور رقیب روسیاہ زہر دینے کی فکر میں ہے۔ سوائے ہم چند کے کسی کا پاس آنا گوارا نہ تھا۔ محبت کے اندر ناکامی کا انجام پورے بھیانک انداز سے تماشے دکھا رہا تھا۔ چار مہینے کے لئے بڑی بہن کے ساتھ نینی تال چلے گئے۔ اور خدا خدا کر کے تندرست و توانا ہو کر واپس آئے۔ پھر نارمل زندگی کی کوشش میں اُدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے لگے۔ کچھ دن بمبئی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا۔ وہاں سے واپس آئے تو لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانہ میں نئے ادب اور اس کے سب پرچم کی ادارت کرتے رہے۔ جب ساتھی اِدھر اُدھر بکھر گئے تو پھر دلی واپس آگئے اور ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی جگہ پر کام کرنا شروع کیا۔ ماں بہنوں نے دل کی چوٹ کا علاج کرنا چاہا۔ صفیہ آپا کی دوستوں میں سے ایک کو جگن بھیا سے کچھ ہمدردی اور کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے کچھ غیر مطمئن بھی تھیں۔ صفیہ آپا کی تحریک پر انہوں نے جگن بھیا کو اپنانے پر آمادگی ظاہر کی۔ شکل وصورت کے اعتبار سے نہ حسینوں میں شمار ہو سکتا تھا اور نہ بدصورتوں میں، پڑھی لکھی تھیں، برسر روزگار تھیں۔ لیکن طبیعتاً گھر ملو قسم کی تھیں جگن بھیا سے محض صفیہ آپا کے توسط سے بس ایک دو دفعہ کی ملاقات تھی دل کے ملاپ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن جگن بھیا نے سوچا شاید اسی رشتہ ہی میں نجات ہو۔ اور زندگی کے منتشر تاریک جالے ہو سکیں، زخم رستا بند کردے۔ جذبات کا تو دِل میں گلا گھٹ ہی چکا تھا۔ نہ جانے کس دل سے، اپنے کو سمجھا کے سپرد کر پائے ہوں گے۔ بہر حال اس رشتے پر راضی ہو گئے۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ ایک دفعہ۔۔۔۔ کے سرپرست سے مل لیں اور معاملہ طے ہو جائے۔

اس زمانہ میں جگن بھیا دلی لائبریری میں کام کر رہے تھے وہاں سے بلائے گئے۔ اور بردکھوے کے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ لاکھ سر پر ٹیڑھی ترچھی ٹوپی رکھی جائے اور استری شدہ شیروانی پہن کر جاذب نظر بننے کی کوشش ہو لیکن ہزار ڈیڑھ ہزار کمانے والے کالج کے پرنسپل کے لیے ڈیڑھ سو روپے ہر مہینے پانے والے اسسٹنٹ لائبریرین میں کشش پیدا نہ ہو سکی۔ خالی ہاتھ لوٹا دئے گئے۔ عورت کو آنچل سے پرچم بنانے کا پیام بجا اہمیت تھا لیکن اس پیام پر عمل کرنا۔ معاملہ خطرناک تھا۔ ایک طرف ہزاروں کمانے والا سرکاری عہدے دار، دوسری طرف دل شکستہ خالی جیب والا شاعر۔ زر کی جیت ہوئی۔ فن پھر شکست کھا گیا۔ شاعر نے ایک دفعہ دل کی آواز پر قدم اٹھائے تھے اور منہ کے بل گر گیا تھا۔ اس مرتبہ اس نے عقل پر بھروسہ کیا اور تھم تھم کر رک رک کر، احتیاط کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھایا، پھر بھی ٹھوکر کھایا اور کھسیا کر رو پڑا۔ تدبیر کے پائے سنگین پر تقدیر نہ جھک سکی اور شاعر پر ۱۹۴۵ء میں دیوانگی کا دوسرا حملہ ہوا۔ اب وہ خود ہی اپنی عظمت کے راگ گاتا تھا۔ شاعروں کے نام کی فہرست تیار کرتا تھا۔ اور غالب و اقبال کے نام کے بعد اپنا نام لکھ کر شجرہ ختم کر دیتا تھا۔ ڈاکٹروں کی کوشش اور جان توڑ تیمارداری اور دلجوئی سے کسی طرح قابو میں آ ہی گئے۔ لیکن زندگی کا ڈھرہ تو بدل نہ سکا۔ بیکاری اور تنہائی کا ساتھ رہا۔ شراب نوشی بڑھتی گئی۔ زندگی میں تلخیاں بڑھتی گئیں اور وہ ان تلخیوں کو غرق مئے ناب کرتے رہے۔ غرضکہ یہ سلسلہ جاری رہا اور اس جال میں جگن بھیا کی زندگی، وجود سب ہی کچھ الجھ کر رہ گیا۔ لوگوں نے کہا۔ مجاز کا علاج شادی۔ لیکن یہ علاج ہوتا تو کیوں کر، مجاز کی جیبیں خالی تھیں۔ جہاں بھی گھر والوں نے ہاتھ پھیلایا۔ جواب ملا، ٹھے کے ساتھ تو نہیں البتہ

چھوٹے کے ساتھ چاہو تو کر لو۔ وہی مجاز جو کبھی اس میدان میں آرزوؤں کا مرکز تھا کوڑا کرکٹ بن کر رہ گیا۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ ان مایوسیوں کو جگن بھیا سے چھپائے رکھ سکیں لیکن اندازہ ہو ہی جاتا تھا اور سوائے اس کے کہ ان کی مسکراہٹ میں تھوڑی سی تلخی اور گھل جاتی۔ کسی طرح بھی ظاہر نہ ہوتا کہ وہ زمانہ کی ناقدری کے شاکی ہیں۔ ماں بہنوں کی ہمت نے جواب دے دیا کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ایک طرف تو منہ توڑ جواب کا ڈر۔ دوسری جگن بھیا کی رضامندی حاصل کرنے کا مسئلہ۔ کیونکہ تجربہ یہ ہو چکا تھا کہ جنسی بھوک خواہ کتنی شدید کیوں نہ رہی ہو۔ عورت کی پرکھ ان میں ختم نہ ہوئی تھی۔ (صرف دیوانگی کے عالم میں ایسا ہوا کہ یہ بھوک پوری طرح سے ان پر حاوی اور یہ پرکھ ختم ہوئی) ماں کے ایک قریبی عزیز نے اپنی لڑکی کے لئے منظوری دیدی تھی۔ نیت کا حال خدا جانے، جانے اماں کی مایوسی اور پریشان حالی سے متاثر ہو کر یا جگن بھیا کی برباد حالی پر رحم کھا کر دیا پھر انہیں سمجھ بوجھ کر اور ان کی قدر شناسی کے طور پر۔ بہرحال وہ راضی تھے۔ جگن بھیا سے پوچھا گیا۔ کافی عرصہ تک ٹالا کئے، اپنے دل کو ٹٹولتے رہے اور آخر کو ماں سے کہہ ہی دیا کہ ماں اس لڑکی میں میں کوئی کشش نہیں پاتا۔ اس کی قسمت پھوٹنے پر کیوں تلی ہو۔ یہ اپنی قسم کا ان کی زندگی میں دوسرا واقعہ تھا۔ ایک واقعہ علی گڑھ میں سنہ ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ ایک متمول آزاد خیال گھرانے کی نہایت تیز طرار لڑکی نے صفیہ آپا کے ذریعہ ان سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس کا جواب جگن بھیا نے یہ دیا تھا "صفیہ مجھے کاغذی پھولوں سے دلچسپی نہیں" نفس مضمون دونوں جوابوں کا ایک ہے۔ لیکن جن حالتوں میں دئے گئے ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کا پہلا جواب اس وقت کا تھا

جب وہ فلک شاعری پر اُبھر رہے تھے۔ اُن کے سامنے زندگی کا میدان دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ اُمیدوں کے رنگ آمیز پرچم لہرا رہے تھے اس لیے اس جواب کو تکبر اور خودسری کی دلیل سمجھا جا سکتا ہے لیکن اُن کا دوسرا جواب اُس وقت کا ہے جب وہ بالکل ٹوٹ چکے تھے، در در سے ٹھکرائے جا چکے تھے، جنسی تشنگی کا شکار تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی عورت سے زیادہ عورت کا تصور اُنہیں عزیز رہا۔ اس جواب میں ایثار ہے۔ شعور ہے۔ کردار کی بلندی ہے۔ بہرحال جگن بھیا کو ایک ساتھی نہ مل سکا۔ جو ان کے دل کی آواز کو سمجھ سکتا۔ اُن کو سہارا دے سکتا جس کی ڈھارس سے وہ زندگی کی تھکن دور کر سکتے۔ اُنہیں رفاقت نصیب تھی تو وہ شراب کی۔ وہی اُن کا واحد سہارا تھی۔ اندھیری رات کے مسافر کی منزل خود فراموشی کے دھندلکے میں اوجھل سی ہوگئی۔ ان کے چہرے کی تابانی پہ ڈھیر سے ڈھیر بے بسی کا بردہ گہرا ہوتا گیا۔ آنکھوں کی جگہ اتھاہ گہرائیوں نے لے لی۔ جس میں اُمیدیں، آرزوئیں دفن ہوں۔ یاس و محرومی جھانک رہی ہو۔ کس غضب کی گہرائی تھی ان آنکھوں میں۔ کیا کچھ پوشیدہ تھا اُن میں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُن کا دل بجھ سا گیا ہو۔ جیسے اُن میں اُبھرنے کی خواہش باقی نہ رہی ہو۔ غرضکہ سہم سکڑ کر اقبال عشرت آیا کے وہ بالکل نکھٹو رہ گئے۔ نکھٹو بھی ایسا جو شرابی ہو اور شرابی بھی ایسا جسے پیتے وقت اس بات کا بھی ہوش نہ ہو کہ کتنی پی رہا ہے۔ اور کیسی پی رہا ہے۔ میں نے اکثر چاہا کہ ان سے منت کروں، التجا کروں کہ وہ اپنے کو سنبھالیں۔ لیکن جب بھی میں نے ارادہ کیا۔ میری ہمت جواب دے گئی آوارہ کا مصنف اتنا سخت دل نہیں ہو سکتا کہ ماں کے آنسوؤں سے نہ پگھل سکے۔ جس وقت ماں اُنہیں سمجھاتیں۔ زندگی کا اونچ نیچ سمجھاتیں۔ گھر کی بگڑی

ہوئی حالت کا احساس دلائیں، اپنی محبت، باپ کی عزت کا واسطہ دیتیں۔ آپکے چہرے سے تاثرات بتاتے کہ ماں کے آنسوؤں کا ہر قطرہ اُن کے دل پر نشتر کی طرح لگتا۔ پھر بھی نہ معلوم وہ کس اُلجھاوے میں پھنسے تھے جس سے وہ اپنے کو نہ نکال پائے۔ غرضکہ وہی جگن بھیا جو ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھے پریشانیوں، اور الجھنوں کا مرکز بن کر رہ گئے۔ کبھی ہم اُن کی شراب نوشی اور خود فراموشی پر جھنجھلاتے۔ تلخ ہوتے، جی چاہتا کہ اُنہیں اتنا جھنجھوڑیں کہ اُن کے ہاتھ سے "فریب بیخودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر" جھنجھنا کر ٹوٹ جائیں۔ اور وہ چونک کر پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑیں۔ کبھی جی چاہتا کہ اُنسے چمٹ کر اتنا روئیں کہ ہمارے آنسو اُن کے جمود کو بہالے جائیں۔ اور وہ پھر یہ کہہ اُٹھیں:

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ایسا لگتا ہے جیسے اُن کا عدم وجود سب برابر ہو جیسے وہ ہمارے درمیان ہوتے ہوئے بھی ہماری پہنچ سے باہر ہوں۔ جیسے وہ بہت دور خلاؤں میں گم ہو رہے ہوں پتہ ہی نہ چلا کہ اُن کے دل کی گہرائیوں میں کیا پوشیدہ ہے چوٹیں کھاتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔ پینتالیس سال کی عمر میں ایک دفعہ بھی تو ایسا نہ ہوا کہ اُنھوں نے ایک دفعہ بھی زندگی کی شکایت کی ہو۔ یا کسی کا شکوہ کیا ہو۔ زندگی میں ایسا زبردست اعتماد۔ اور اپنی زندگی سے اتنی بے نیازی "تلخیاں سہتے عمر بیتی۔ اور مزاج میں ذرا تلخی نہ پیدا ہوئی" کبھی تو کسی بات پر جھنجھلا اُٹھتے، بیزاری کا اظہار کرتے۔ سب کچھ خاموشی سے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۶۳ء میں تیسرا اور آخری نروس بریک ڈاؤن کا

حملہ ہوا اور اس غضب کا شدید کہ خدا کی پناہ، گھر میں ٹکنا ہی گوارا نہ کیا۔ دِلّی کی گلی کوچوں کی خوب خوب خاک چھانی۔ جلتی محرومی کے تماشے دِلّی والوں نے خوب خوب دیکھے جس انسان نے عالمِ مدہوشی میں کبھی بھی کوئی چھچھوری اور رکیک حرکت نہ کی تھی وہ ہر لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ گھر والے اس خبر کے منتظر تھے کہ مجازؔ موٹر سے کچل گیا۔ ٹھٹھرا ہوا سڑک پر پایا گیا ـــــ انجام یہی ہونا تھا لیکن کچھ دن ٹھہر کر۔ وہی ستر سالہ ماں جس نے بیٹے کے مستقبل کے نہ جانے کتنے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ جانماز پر بیٹھ کر دعائیں مانگتی تھی کہ یا الٰہی! اسے اُٹھالے یا مجھے جو میں اس طرح کے تماشے نہ دیکھوں۔ دِلّی سے جوشؔ صاحب کا خط آیا کہ مجازؔ کو آگرہ بھیجدیا جائے۔ مجازؔ اور آگرہ کا پاگل خانہ، دل پر کیسی چوٹ لگی۔ لیکن مجازؔ پاگل تھا اس حقیقت سے کیسے انکار ہوسکتا تھا۔ پاگل کو آخر کیسے اور کہاں تک بھگتا جاتا۔ جوشؔ صاحب کو میں نے خط لکھا کہ اپنے رسوخ کو استعمال کرکے رانچی میں جگہ دلوادیں۔ جوشؔ صاحب کو خط ملا یا نہیں بہرحال میں جواب کے انتظار میں ہی رہی۔ ڈاکٹر ڈیوس اسپتال کے انچارج سے خط و کتابت کی۔ جگن بھیا کی لائف ہسٹری لکھ کر بھیجی شاید اُن کی زندگی کے واقعات سے متاثر ہوکر اُس نے بی کلاس وارڈ میں ایک بیڈ دے ہی دیا۔ ورنہ ایسے سپتال میں بغیر سفارش کے جگہ کب ملتی ہے۔ مجازؔ کو بمشکل رانچی پہنچایا گیا بوڑھے باپ نے اپنی پونجی کی آخری کوڑی بھی انہیں بچانے کیلئے لگادی اور چھ مہینے کے بعد وہ بچ کر آگئے۔ ان کی واپسی کے ایک مہینہ بعد صفیہ آپا کا انتقال ہوا۔ اس صدمہ کا اثر اُن پر بجلی کے شاک جیسا ہوا۔ جیسے یکدم چونک پڑے ہوں ایک مرتبہ پھر اُن میں ذمہ داریوں کا احساس جاگا۔ جاذؔ و ادیکین کی پڑھائی اور دیگر مشغلوں میں دلچسپی لیتا، اُنکی دلجوئی کرنا زیادہ تر وقت گھر پر گذارنا۔ شراب سے

قطعی پرہیز۔ رات کو جی بھر کر سوتے۔ دن میں ہنستے کھیلتے۔ باتیں کرتے گھنٹوں سب کے ساتھ تاش کھیلا کرتے۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے۔ تصویریں بنا بنا کر سب میں بانٹتے، چھوٹے بچوں کو ایک دوسرے سے لڑواتے۔ ایسا لگتا جیسے جادو۔ ادیب۔ عشو۔ عرفی کے بچپن میں میرا بچپن دہرا رہا ہو۔ جگن بھیا پھر بیس پچیس سال والے جگن بھیا بن گئے ہوں۔ لیکن بنیادیں تو نہ بدلی تھیں۔ زندگی کا یہ نیا ڈھانچہ کیوں کر کھڑا رہتا۔ کاش اس وقت اُنکا ہاتھ کسی نے تھام لیا ہوتا، اُن کے لیے کسی نے ساز بیداری اُٹھا لیا ہوتا لیکن ایسا کیوں ہوتا اُن کی موت کو اُن کی زندگی کا نقطۂ عروج بننا تھا۔ اُنہیں تو یہ دکھانا تھا کہ جیتے جی مرنا کسے کہتے ہیں اور مر کر کیسے جیا جا سکتا ہے غرضکہ چھ مہینے تک جگن بھیا بالکل نارمل رہے۔ چاہنے والے ساتھی اور سچے دوست اپنے اپنے کام دھندوں میں اِدھر اُدھر لگے ہوئے تھے۔ اُن کی ظرافتِ طبع اور بذلہ سنجی سے لطف اُٹھانے والے ناسمجھ دوستوں اور اُن کی شاعری کو کھلونا سمجھ کر دل بہلانے والے نادان ادب نوازوں نے اُنہیں پھر شراب خانے کی طرف رجوع کرنا شروع کیا۔ وہاں قدم رکھنے کے بعد اُن کے قدم تیزی سے اس طرف اُٹھنے لگے۔ راتوں کو مدہوشی کے عالم میں دو تین بجے گھر واپس آنا۔ دن میں دس گیارہ بجے خمار کے عالم میں اُٹھنا منہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ پر ناشتہ کرنا۔ تھوڑی دیر اخبار کے اوراق اِدھر اُدھر پلٹنا۔ یہ تھا اُن کا پروگرام۔ اس درمیان ماں موقع پا کر کوشش کرتیں کہ رات کی کیفیت کا انہیں احساس دلائیں اور آئندہ کیلئے احتیاط پہ آمادہ کریں۔ چپ چاپ سب کچھ سنا کرتے۔ ایک خاموشی ہر بات کا جواب تھی۔ جب اندرونی کشمکش برداشت سے باہر ہو جاتی

تو اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے اور پھر سب بچوں کو یکجا کر کے اُن کے ساتھ کھیل
میں اپنے کو بھولنے کی کوشش کرتے، گھر میں ماشاء اللہ بچوں کی تعداد بہت
طویل تھی۔ سات عدد بچے تھے۔ دو صفیہ آپا کے۔ دو میرے اور تین میرے
بھانجے کے۔ اور ان سب میں بھانجے کا تین سالہ بچہ عرفی انہیں عزیز تھا۔ اماں کہتی
ہیں کہ اُس کا بچپن جگن بھیا جیسا ہے۔ بہت شریر اور بے خبر۔ اس سے خود کو استاد
کہلاتے اور کہتے کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ اُس کو اپنے پاس کھڑا کر لیتے تب کھانا کھاتے
وہ اپنی گندی گندی اُنگلیوں سے سالن کے پیالے کی بوٹیوں کی چھین جھپٹ
کیا کرتا۔ آخر کو آدھی آدھی پہ معاملہ ہو جاتا۔ خود بھی بہت گندے طریقے سے
کھانا کھاتے چاول میں دال سالن ملا کر اُنگلیاں اس قدر تیزی سے چلاتے
گویا کسی ساز پر چل رہی ہوں۔ یہاں تک کہ پلیٹ میں جھین سا پیدا ہو جاتا۔ تب
منہ میں لقمہ لے جاتے۔ منہ ذرا کم کھلتا تھا اس لئے کھاتے وقت ہمیشہ ایک
قسم کے سڑکنے کی سی آواز پیدا ہوتی۔ سب بچے اُن کو بچو دادا کہتے تھے
عالم ہوش میں بھی وہ ایک طرح کی خود فراموشی ان بچوں میں کھو کر حاصل کر لیتے
تھے۔ شام ہوتی۔ کپڑے بدلتے۔ کپڑوں کی صفائی اور نفاست کا لحاظ ہر
عالم میں رہا۔ تیسرے دن کپڑے ضرور تبدیل کرتے تھے۔ تھوڑی دیر اِدھر
اُدھر ٹہلتے۔ ایسا لگتا جیسے سوچ رہے ہوں جاؤں یا نہ جاؤں کبھی کبھی ایسا
بھی ہوتا کہ ہفتہ ہفتہ گھر سے نہ نکلتے لیکن آخر ایسے کب تک گذر ہوتی۔
آخر کو چل ہی دیتے۔ شاید اس ارادے کے ساتھ کہ اب اپنے کو کھو کر واپس
نہ آؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن باہر جا کر اُن کی قوت ارادی بالکل جواب دے جاتی
پھر اسی ایماء میں واپس آتے۔ کبھی پیدل کبھی رکشا میں۔ کھانا۔ سگریٹ اور
پان سمیت اُن کے کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ یہ مدتوں پُرانا معمول تھا اگر کچھ ہوش

میں ہوتے تو کھانا کھا لیتے۔ ورنہ پھر صبح کھاتے۔ غرضکہ دن کو بیکاری اور رات کو شراب نوشی کا زہر ان کی زندگی کو گھن کی طرح لگتا رہا۔ اور ہم سب یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ آخر ایک دن سب نے سن لیا کہ مجاز مر گیا۔ پتھروں پر سسک سسک کر، ٹھنڈ میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر۔ یہ مجاز کی موت تھی، فنکار کی موت۔ شاعر کی موت — کہانی پوری ہوئی۔ ڈرامہ ختم ہوا۔ پردہ گر گیا۔ پر ایسا کیوں ہوا ایسا کیسے ہوا۔ یہ خلش، یہ کھٹک ہر دل و دماغ میں باقی رہ گئی۔

میرا دوست، میرا مہمان

یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ مجازؔ ان دنوں ہارڈنگ لائبریری دہلی میں کام کرتا تھا اور میں وکٹوریہ کالج گوالیار میں لکچرار تھا۔ کالج میں ہر سال دسمبر کے مہینے میں سالانہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ لیکن بزم ادب کا فنڈ بہت ہی مختصر اور محدود تھا۔ اس لئے بیرونی شعراء میں سے ایک دو ہی کو مدعو کیا جا سکتا تھا۔ اس سال بزم ادب نے صرف مجازؔ کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ اور مجازؔ میرے خط کے بعد گوالیار آنے پر مجبور ہو گیا۔

مجازؔ پہلی بار ہم لوگوں کے گھر آ رہا تھا۔ صفیہ[1] کی خوشی کی انتہا نہ تھی وہ مجازؔ کو لینے خود اسٹیشن گئی۔ مجھے دو دن سے بخار آ رہا تھا۔ اس لئے اس نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی۔ مجازؔ آئے اور گھر کی رونق میں دونا اضافہ ہو گیا۔

---

[1] مجازؔ کی بہن اور اختر کی اہلیہ

اُس کے آتے ہی ہمارے گھر دوستوں کا جمگھٹا ہونے لگا۔ مقامی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ شہر کی کتنی ہی ادب نواز خواتین بھی اُسے دیکھنے اور اُس سے ملنے کے لیے غیر متوقع طور پر ہمارے یہاں جمع ہو گئیں۔ مجاز کی شاعری میں جو لطیف رومانی عنصر ہے اُس نے مجاز کو ہمیشہ خواتین کے حلقہ میں حد سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز بنا رکھا ہے۔ وہ خود کو اگر شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں کہتا تھا تو اُس کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا۔

اُسی شام یہاں مشاعرہ تھا۔ میں کالج کے مشاعرہ میں بھی نہ جا سکا میرے عزیز دوست اور ہندی کے مشہور کوی شیو منگل سنگھ سمن جو اس وقت کالج میں میرے ساتھی پروفیسروں میں تھے مجاز کو اپنے ساتھ کالج لے گئے مشاعرہ ہوا اور بہت کامیاب ہوا۔ دوسرے روز کوی سمیلن تھا۔ سمن شام ہی سے مجاز کو اپنے گھر لے گئے تھے۔ وہاں ایسی محفل جمی کہ تقریباً ساڑھے دس بج گئے۔ جس وقت مجاز اور سمن کالج پہنچے۔ کالج کے لڑکے بطور احتجاج کوی سمیلن کے بائیکاٹ پر اُتر آئے۔ سمن نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی لیکن طلبا بے قابو ہو چکے تھے۔ آخر کار مجاز نے اُٹھ کر ذاتی طور پر معذرت چاہی اور اس تاخیر کے الزام کو اپنے سر لے لیا۔ اُس نے کہا "آپ بیشک مجھے دسنے لگا۔ جس کی وجہ سے آپ کو یہ تکلیف اُٹھانی پڑی Funeral آپ کا ہے۔ آپ خود اس کا بائیکاٹ کیسے کر سکتے ہیں۔"

مجاز کے اس اخلاقی اقدام نے جادو کا سا اثر کیا۔ اور ساتھ ہی "آوارہ" "آوارہ" کے تقاضوں سے ہال گونجنے لگا۔ اور ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ مجاز اپنے مترنم مگر ٹوٹے ہوئے لہجے میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی بات کہہ رہا تھا۔

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں؟

جو لوگ مجاز کو اس کی بے روزگاری کیلئے ہدف ملامت بناتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ اس کی بے روزگاری کے پیچھے اس کی ناکام معاشی جدوجہد کی کتنی لمبی داستان چھپی ہوئی ہے۔ اس نے کئی ملازمتیں کیں، لیکن کوئی ملازمت اسے راس نہ آئی اور اس کا کھلا ہوا سبب یہ تھا کہ اس نے کسی جھوٹی مفاہمت کی آڑ لے کر اپنے ضمیر اور ترقی پسندی کو بیچنا گوارا نہیں کیا۔ تقریباً ڈھائی بجے رات کو کوی سمیلن ختم ہوا۔ کالج کے لڑکوں نے مجاز کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس رات کا ہیرو مجاز ہی تھا۔

دوسرے دن ہم لوگ مجاز کو گوالیار کے تاریخی مقامات دکھانے کیلئے لے گئے۔ گوالیار کا قلعہ۔ رانی جھانسی کا میموریل، تان سین کا مزار۔ بیجو کیم وغیرہ۔ تان سین کے مزار پر مجاز، حیدر میاں اور ایوب مرزا دیر تک بیٹھے قوالی گاتے رہے۔ واپسی پر مجاز مجھ سے کہنے لگے ــــــ

"آخر یہ تان سین کا مسلمان ہو جانا بے سبب نہیں، اتنا بڑا آرٹسٹ محمد غوث کے بہکانے میں تو نہیں آ سکتا ــ" لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ ایک غیر مستند روایت یہ بھی ہے کہ اس نے کسی مسلمان لڑکی کے عشق میں اسلام قبول کر لیا تھا تو مجاز خوش ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ "بس یہی مستند، باقی سب غیر مستند" پھر وہ رات بھر گنگناتا رہا:

عطیہ کی بدولت آج ایک کافر مسلماں ہو گیا

ہم لوگ گھر واپس ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ مجاز نے "تمنا" کی فرمائش کی، یہ گوالیار کی خاص شراب ہے اپنے ذائقے اور نشے کے اعتبار سے بہت تیز و تند ہوتی ہے۔ دوسرے دن تو مجاز نے اسے "مئے مردانگی" کا لقب دے دیا تھا۔ غرض کہ باہر کے کمرے میں محفل جمی۔ میرے دو ایک دوست مجاز

شریک تھے۔ کوئی دس بجے کے قریب سب کے سب رخصت ہو گئے
بعد میں اور مجاز تنہا رہ گئے۔ اس زمانے میں مجاز شراب کے بعد بھی خاموش
سا رہنے لگا تھا۔ لیکن اس رات اس نے نہ جانے کتنی باتیں مجھ سے کہہ
ڈالیں۔ عام طور پر مسلسل گفتگو مجاز کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن آج وہ متواتر
گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک اکیلا ہی بولتا رہا۔ اسے اپنے بہت سے عزیز دوستوں
سے، شکایت تھی۔ اسے اس "زہرہ جبیں" سے بھی شکوہ تھا جس سے اسے
خود نہیں معلوم تھا کہ وہ آخر کیا چاہتا ہے۔ پھر بھی وہ یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ
اسے جو محبت جواب میں ملنی چاہئے تھی اس میں کہیں کمی ضرور رہ گئی ہے۔ مجاز
بڑے موثر لہجہ میں کہنے لگا۔ "اختر میں چاہتا تھا کہ اپنے مجموعہ کے کسی ایڈیشن
کو اس کے نام منسوب کر دوں لیکن اس نے منظور نہیں کیا۔"

میں نے اسے متاثر ہوتے دیکھ کر بات کا رخ موڑنا چاہا۔ میں نے کہا
"لیکن یہ فیض کے دیباچہ کا نام جو تم نے آہنگ کا انتساب کیا ہے اس سے
تو کہیں بہتر تھا کہ تم فیض ہی کے نام منسوب کر دیتے۔" اس نے مجھے
بتایا کہ یہ انتساب اس کا کیا ہوا نہیں، خود مکتبہ والوں کی ذہنی اپج ہے
پھر وہ فیض کے بارے میں بہت سی باتیں کرتا رہا۔ اسے اپنے ہمعصروں
سے فیض اور جذبی سے بے حد پیار تھا۔ جذبی سے اپنی کئی لڑائیاں بھی بیان
کرتا رہا۔ پھر وہ خود میرے اور صفیہ کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اپنے
گھر میں اسے صفیہ سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ صفیہ کو وہ بہت زیادہ
چاہتا تھا اور ساتھ ہی ذہنی طور پر مرعوب بھی تھا۔ کرشن چندر نے زیرِ لب
کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "اپنی سماجی سوجھ بوجھ میں، اپنے انداز نگارش میں
اپنے محسوسات کی تنظیم و ترتیب میں صفیہ مجاز سے بہت آگے تھی: تو

تو مجاز کو اس بات کا احساس ہی نہیں اعتراف بھی تھا، صفیہ کے مرنے پر جو خط اس نے سہیل عظیم آبادی کے نام لکھا ہے اور جو اتفاق سے پوسٹ کرنا بھول گیا تھا وہ اس کے کاغذات میں موجود ہے۔ اس میں مجاز نے لکھا ہے صفیہ کی موت پر "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا ذہن ہمیشہ کیلئے سو گیا ہے۔" حد یہ تھی کہ مجاز نے صفیہ کے سامنے کبھی پی کر آنے کی ہمت نہیں کی۔ لیکن اس رات وہ صفیہ کے متعلق بے تحاشا باتیں کرتے کرتے یہ بھول گیا کہ وہ بہت زیادہ نشے کے عالم میں ہے۔ اور اُس نے بیچارگی سے مجھ سے کہا کہ "اختر! صفیہ کو بلا دو۔" میں نے اندر جا کر صفیہ سے کہا "مجاز تم کو بلاتے ہیں۔" لیکن صفیہ تیار نہ ہوئی۔ اس نے کہا "اختر! تم یقین کرو کہ میں نے کبھی اسرار بھائی کو اس عالم میں نہیں دیکھا ہے۔ اور نہ میں انہیں اس عالم میں دیکھنے کی تاب رکھتی ہوں۔ یہ میری جذباتی کمزوری ہے۔ اور اگر میں اس وقت بالفرض چلی بھی جاؤں تو اسرار بھائی پر صحیح معنی میں اس عبادت کا بہت برا رد عمل ہوگا۔ اور وہ کل تو چلے ہی جائیں گے لیکن پھر کبھی میرے گھر آنے کی شاید اُن میں ہمت نہ رہے۔" میں نے صفیہ سے کوئی اصرار نہ کیا اور باہر آکر مجاز سے صفیہ کی یہ کمزوری بیان کر دی۔ صفیہ کے انکار پر مجاز نے بے قابو ہو کر رونا شروع کر دیا۔ میرے گلے میں دونوں ہاتھ ڈالے وہ بڑی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ اُدھر صفیہ نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ آخر اسی عالم میں مجاز بغیر کھانا کھائے بستر پر پڑ کے سو گیا۔ اور صفیہ اُس کے سرہانے اس کے سر پہ ہاتھ رکھے۔ اوی رات بیٹھی روتی رہی۔ صبح جب مجاز کی آنکھ کھلی تو صفیہ نے مجاز کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور دیر تک

اُس کے سینے میں منہ چھپائے روتی رہی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجاز نے صفیہ سے یا صفیہ
نے مجاز سے کچھ کہا یا نہیں کیوں کہ میں اس کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ اگر نہ چلا جاتا
تو خود بھی رو پڑنے میں کسر نہ رہ گئی تھی۔

مجاز کا ارادہ اُسی دن روانگی کا تھا۔ لیکن صفیہ نے ہرگز اُسے جانے
کی اجازت نہ دی۔ وہ پھر مجاز گھر ہی رہے۔ حامد میاں نے مجاز کے پیچھے
پڑ کے اُسے بیت بازی کے لئے راضی کر لیا۔ حامد میاں، ایوب مرزا، ساجدہ اور
مجاز ایک طرف ہو گئے اور میں تنہا ایک طرف۔ بیت بازی کے لئے موضوع
کا انتخاب کیا گیا "آنکھ" اور یہ قید اُٹھا دی گئی کہ فلاں حرف سے مصرع شروع ہو
البتہ شعر کے معیاری ہونے کی شرط تھی۔ اور اسی کے لئے صفیہ جج مقرر کی گئی۔ مجاز
کو تو اچھے شعر یاد تھے۔ اصل بیت بازی کی امید میاں سے ہوتی رہی۔ مجاز اُن کا سہارا
بنے رہے جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے سب تماشا شعر یاد رہے۔ ثنا گیا بن رشیق
نے شاعر ہونے کے لئے ایک لاکھ شعر یاد ہونے کی قید لگائی ہے۔ اگر وہ کچھ نیا یہ
کی قید بھی لگاتا تو ہم سے کم مجھے فکر نہ ہوتی۔ صفیہ کہا کرتی تھی کہ اختر تمہارا دماغ
اس معاملہ میں "کباڑ خانہ" ہے، اچھے بُرے، اُلٹے سیدھے ہر طرح کے شعر تمہیں یاد
کیسے رہ جاتے ہیں۔ بہرحال تین چار گھنٹے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ حامد میاں
کا خزانہ ختم ہونے لگا۔ اور مجاز نے شعر گھڑنا شروع کر دیے۔ ظاہر ہے کہ جلدی
میں گھڑا ہوا شعر معیاری کیسے ہو۔ جہاں مجاز نے شعر دیا اور صفیہ نے "اڑا دو"
کر دیا۔ نتیجہ میں حامد میاں اور مجاز کو مات ہوئی۔ اور صفیہ نے دونوں سے وعدہ
کے مطابق سب پیسے وصول کر لئے۔

اس رات شراب کو محفل سے نکال دیا گیا، اور انگیٹھی کے گرد "صبح ہوئی
تھی باتوں میں" والی محفل تقریباً صبح تک ہی جمی رہی۔ نہ جانے کہاں کہاں کے

دلچسپ قصے دو لطیفے مجاز نے سنا ڈالے ان میں ایک لطیفہ یہ بھی تھا کہ قصبہ
ہاتھرس میں دارالخد کے سلسلے میں ایک مشاعرہ تھا۔ خاصی تعداد میں شاعر آئے
تھے۔ دوسری صبح چائے پی جا رہی تھی کہ تحصیلدار صاحب نے سب شاعروں کو بلوا
بھیجا۔ خود ایک کرسی پر تشریف رکھتے تھے۔ برابر میں ایک دوسرے کی تپائی پر منشی جی
بیٹھے تھے۔ جب شاعر جمع ہو گئے تو تحصیلدار صاحب نے نام پکارنے کے لئے
کہا۔ منشی جی نے شاعر کا نام پکارا اور وہ آگے بڑھا۔ تحصیلدار صاحب نے سوال
کیا "آپ سے کیا رقم طے ہوئی تھی۔" وہ ہچکچایا تو انہوں نے ذرا ڈانٹ کر
کہا "بتائیے کیا طے ہوا تھا" مجبوراً اسے بتانا پڑا۔ "دو سو روپے"
تحصیلدار صاحب نے منشی جی کو حکم دیا "آپ کو صرف ایک سو ساٹھ روپے
دیجئے۔" شاعر کچھ خزبز ہوا تو ارشاد ہوا "گڑبڑ نہ کیجئے، تشریف لے
جائیے۔" سب کا یہی حشر ہوا۔ شعرا نے جائے قیام پر پہونچ کر بہت شور
وغوغا مچایا۔ ابھی یہ شور وغل جاری تھا کہ تحصیلدار صاحب کے ایک آدمی
نے آکر اطلاع دی کہ متھرا کی بس تیار ہے۔ سب شعرا صاحبان اسی
بس سے چلے جائیں ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔"

آج کا دن مجاز کی روانگی کا دن تھا۔ مجاز کو کالج سے جو رقم ملنے والی تھی
صفیہ نے مجھے پہلے ہی دن تاکید کر دی تھی کہ اسرار بھائی کے پیسے انہیں بالکل
نہ دینا۔ تم مجھے لا کر دے دینا۔ چنانچہ میں نے اس کے سپرد کر دیئے تھے۔ مجاز نے
کالج کے پیسوں کا تقاضا ابھی تک مجھ سے نہ کیا تھا۔ لیکن آج اسے جانا تھا اور
اتفاقاً اس کے پاس کرایہ بھی نہ رہا تھا۔ چنانچہ دبی زبان سے اس نے مجھ سے
کہا "اختر! کالج سے اگر ایسی سا کرایہ مل جاتا تو اچھا تھا۔" میں نے اس سے
کہا۔ تمہارے پیسے صفیہ کے پاس رکھے ہیں۔ وہ مطمئن ہو گیا لیکن چلتے وقت

جب صفیہ نے چالیس روپے لا کر دئے کہ یہ آپ کے ٹکٹ کے پیسے ہیں، باقی کے میں نے آپ کے کپڑے سلوا کر آپ کے بکس میں رکھ دئے ہیں تو وہ بہت جھنجھلایا کہنے لگا۔ "کپڑوں کی کیا ضرورت تھی۔ میرے پاس ضرورت سے زیادہ کپڑے موجود ہیں" صفیہ نے کہا۔ "وہ تو مجھے پتہ ہے آپ کے پاس جتنے کپڑے ہوں گے۔" آخر میں مجاز کہنے لگا۔ "تم بھی تحصیلدارنی سے کم نہیں ہو۔" اور ہم سب دیر تک رات کے سُستے ہوئے قصے کی روشنی میں اس فقرے کا لطف لیتے رہے۔ میں نے کہا۔ "چلو صبر کرو۔ زیادہ سے زیادہ اسی طرح مشاعرہ میں تمہارے بھی چالیس روپے کٹے ہوں گے۔ سمجھو وہ یہاں مل گئے۔" کہنے لگا۔ "ان پیسوں کے بھی صفیہ نے جوتے وغیرہ خرید دئے ہوتے تو ہم کیا کر لیتے۔"

آخر وہ لمحہ بھی آگیا جب مجاز رخصت ہونے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ صفیہ دیر تک اس سے لپٹی کھڑی رہی۔ مجاز نے اس کی مانگ پر پیار کیا اور اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے جاوید کے لئے کھلونے خریدے اور مجھے دئے کہ میں اُسے دیدوں۔ ویٹنگ روم میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایوب نے آکر اطلاع دی کہ مجاز صاحب ٹرین آرہی ہے۔" مجاز نے برجستہ کہا۔ "میں کیسے روک سکتا ہوں۔"

ٹرین آئی اور مجاز مجھ سے گلے مل کے روانہ ہو گیا۔ واپسی میں گھر میں عجیب سناٹا محسوس ہوا۔ اُس شام میں اور صفیہ صرف مجاز ہی کی باتیں کرتے رہے۔ مجاز جو اُس کا پیارا بھائی تھا اور میرا پچیس سال کا دوست، اور آج جب نہ صفیہ باقی ہے اور نہ وہ گھر باقی ہے۔ میں سوچتا ہوں اس دل سے تو وہ میرا دوست میرا ایمان کبھی نہ جا سکے گا۔

★ عشقِ مجازی

ویسے میں مجاز کو بہت کم جانتی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں اصل مجاز سے زیادہ انہیں اُن کی شاعری میں ڈھونڈھ کر پاتی رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ پہلے میری ملاقات اُن کی شاعری سے ہوئی اور جب میں خود شاعر سے ملی تو میں نے انہیں وہی سمجھا جو اشعار نے بنایا تھا۔ ہم نے مجاز کی شخصیت میں بھی اپنے زمانہ کے تمام مجاز ہی دیکھے اور واقعہ یہ ہے کہ مجاز تنہا ہی نہیں وہ اپنے وقت کے سارے دکھوں، الجھنوں، بندشوں اور رکاوٹوں کے خلاف پکارتا ہوا اُٹھا۔ اور خوب اُٹھا۔ پھر نہ جانے منہ کے بل کیوں آ رہا۔

جھوٹ سچ کا عذاب راوی کی گردن پر، مگر سنتے ہیں کہ موصوف ان کے زمانہ میں کہیں ایسے بے موقع کھیل پڑے تھے کہ توبہ ہی بھلی۔ بالکل شجرِ ممنوعہ قسم کی محبوبہ پر کھیل پڑے جو اپنی آبائی مجبوریوں کے ساتھ عشق کے میدان میں تو ہم اتر آئی مگر موصوف کے میدان میں رہ گئیں۔

اور کبھی ہے کبھی سچی بات کہ عشق تو اندھا ہوتا ہے، پر تماشی اندھے نہیں ہوتے۔ خیر! تو نہ جانے کیا بیتی چہرے کی کچی جھجی سی جھنکاری بتاتی ہے کہ کچھ مزے کی نہیں بیتی! ۔ چہ، یہ نوجوان!

ویسے تو آسمان کے ستارے توڑ لائیں گے ۔ ابھی ایک نہیں سارے۔ تختِ سلطان تو کیا، سارا قصرِ سلطان پھونک دینے کی دھمکی دیں گے۔ یعنی پورے تیس مار خاں۔ لیکن جو ذرا میدانِ عشق میں تک بھی لگ گیا تو چپ ۔۔۔ فوراً لیسے ہی لیٹ جائیں گے ۔۔ اور کریں بھی کیا بیچارے۔ ریڈیو کی زدہا بہتریں اور افسانے یہی تو سکھاتے ہیں کہ دنیا میں عشق کے سوا سب فضول ہے۔ زندگی کا پہلا اور آخری مقصد یہی تو ہے کہ جھٹ پٹ موقع بے موقع کسی کے عشق میں مبتلا ہو جاؤ۔ اگر کامیاب ہو گئے تو سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھ جاؤ۔ پھر نکموں اور بھکریوں کی تعداد بڑھانے پر ٹوٹ پڑو۔۔ اگر ناکام رہے تو پاگل ہو جاؤ۔ پھر کیا فکر ہے۔ پاگل ہو جاؤ۔ مزے سے برسوں کا آزمودہ نسخہ ہے۔

خیر جی! کون کہتا ہے کہ عشق نہ کرو۔ جوانی اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ مگر آج کل کے نوجوان تو عشق بھی سلیقہ سے کرنا نہیں جانتے پہلے زمانے میں تو لوگ عشق کیا کرتے تھے اور بس کئے چلے جاتے تھے۔ مگر آج کل کے عاشق کچھ عجیب قسم کی معجون ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ مرضِ عشق میں مبتلا ہیں یا ہزاروں روگ ہیں جنہیں عشق کی آڑ میں چھپا رکھا ہے۔ اور مجال نہ جو کہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے .... ہندوستان کے اس درمیانہ طبقے کے نوجوانوں کے تماشے میں جو زندگی کے سارے بیلوں، بندشوں اور رکاوٹوں کا شکار ہوتے ہوئے بھی جی توڑ کر ان سے کشتم کشتا کر رہے ہیں، اٹھتے بیٹھتے بولا نیلے پیلے میں اور ان کی نوک پر وہ اپنا سینہ ٹیک دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے یہ لوگ کیا

جانیما سلیقے سے عشق کرنا۔ کون جانے وہ عشق تھا یا دنیاوی ڈھکوسلوں کے
خلاف جہاد، جو مجاز کے دل میں شعلہ بن کر بھڑکا۔ ہوش میں آتے ہی مورچہ
بندی شروع ہو گئی ہو گی۔ پہلی جنگ تو خود اپنے گھر کی گورنمنٹ سے، خود اپنے
جائز حقوق کے لیے بھی بہنوں کو پڑھا کر اسکول بھجوانا۔ ان کی شادیاں
کہاں اور کیسے ہوتی ہیں، اس کا سوچ بچار کرنا۔ اگر اس ادنیٰ سے محاذ پر پیچھے
ہٹنا پڑے تو یہ سمجھئے کہ آنے والی فتوحات بھیانک شکستیں ہی نظر آئیں گی۔
بھلا جب اپنے ہی گھر پر جالے تنے ہوں تو دوسروں کے گھر پر کس منہ سے
جھاڑو لے کے جائیں، مگر خوش قسمتی سے مجاز کے والدین اُن لوگوں میں سے
ہیں جو منہ کا نوالہ روک کر بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔

دوسرا محاذ اور یونیورسٹی کے قوانین کے خلاف قائم ہوتا ہے۔ جہاں
آج جبکہ لوکل رسٹرکشن پر توجہ ہو چکی ہوتی ہے۔ چال ڈھال پر
بندش، بول چال پر بندش اور جب زندگی میں یوں چاروں طرف سے ٹانگ
گھسیٹی جا رہی ہو تو کوئی کیا عشق کرے اور کیا عاشقانہ شاعری۔ وہ زمانے تو
لد گئے جب شاعر مزے سے عشق کرتے تھے اور شاعری کرتے تھے۔ اب
تو عشق کی گردن میں پولیس کا ڈنڈا ہے۔ ہاتھ روٹی کمانے میں اُلجھے ہوئے
ہیں۔ پیر غلامی کی زنجیروں میں گھسٹ رہے ہیں۔ ایک نہیں سو ہزار سبب
جان کو چمٹے ہوئے ہیں اور حساس طبیعت ناک پر مکھی بٹھانے کو تیار نہیں۔
ایسی صورت میں اگر شاعری بجائے حسن و عشق کے معجون مرکب نہ بن جائے
تو کیا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کے یہاں عشق و سیاست باہم سموئے ہوئے
نظر آتے ہیں۔ بھلا زندگی میں جب اتنی مجبوریاں ہوں تو کوئی کیوں کر جئے۔ ایسی
صورت میں:

"کوئی نغمہ تو کیا اب مجھ سے مرا ساز بھی سے لے"

پر ایسا ہوتا تو رونا ہی کاہے کا تھا، بھلے ہی دن نہ تھے؟
ساز چھوڑنے پر کون تیار ہے وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہ

"لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری عادت نہیں"

پھر بھی مجبوریاں اور لاچاریاں ضدیں بن گئیں چاودن کی ویڈیو کی نوکری ختم ہو گئی۔ منہ پر تمانچہ سا لگا۔

"کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تری بزم میں!
چھوڑ کر جنت علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں!"

اور اب کہ ......

"آہ تیرے میکدہ سے بے پئے جاتا ہوں میں"
مگر چلتے چلتے باز نہیں آتے

"پھر تری بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں"
ایسے ویسے نہیں بڑی دھوم دھام سے
"سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا میں"

تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مجاز کو واقعی سید ھا سادھا عشق ہوا تھا یا یہ بھی اُس کا وہی حساب تھا جو آجکل کا بیشتر نوجوان سوتے جاگتے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے پر تعبیر نہیں ملتی۔ وہ گھر میں گوشت پوست کی چاندسی دلہن لانا چاہتا ہے یا دُنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی سے ڈھالنے کی خواہش کو وہ دلہن کا روپ دید یا ہے۔ اُس کا عشق تو کچھ اس بری طرح اس دُنیا اور اس کے نظام سے چپکا ہوا ہے کہ وہ اُسے جدا ہی نہیں کر سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی گھر بھی چاند سی دولہن کے پُرنور مکھڑے کی دمک سے روشن نہیں ہو سکتا

جب تک ملک پر سے یہ کہرا تک ہو گی نہیں ہٹائی جائے گی۔ ایک ہی سانس میں وہ محبوب کے رخساروں کی تابانیوں سے تنتنے بھی گاتا ہے اور ان گھنگھور گھٹاؤں کا نوحہ بھی کرتا ہے جو اس کے رُخِ روشن پر چھائی ہوئی ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ چاروں طرف لٹکتے ہوئے وحشی تارے اُس کی سانس گھونٹ دیتے ہیں۔ دانت پیس پیس کر وہ اُن پر ہتھوڑے مارتا ہے۔

ایک چیز جو مجاز کے یہاں پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے شاعر میں اتنی ابھری ہوئی اور واضح نہیں ہے۔ محبوب اور عورت کا تصور بجید انوکھا اور اصولِ شاعری سے ہٹا ہوا ہے پرانی شاعری میں محبوب حسن و جمال کی پوٹ ہوتا تھا اس کے اپنے چند مخصوص حربے ہوتے تھے۔ اور چند انداز جو وہ وقتاً فوقتاً استعمال کرتا تھا مگر اس کے انداز سارے نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے تھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا معشوق ہی کا ذکر ہے یا کسی جابر اور قہار شہنشاہ کا ذکر ہے جو عشقیہ غزل میں سمو دیا گیا ہے اور پھر میں سوچتی ہوں کہ کہیں یہ شاعر تو بڑے ترقی پسند ہوتے ہوں گے۔ مگر بے چارے شہنشاہ کے خوف سے کچھ کہہ نہ پاتے ہوں گے یہ دلوں کی بھڑاس نکالنے کو معشوقاؤں کی آڑ میں سب کچھ کہہ گئے غرض اُن کے یہاں سوائے خوبصورت الفاظ اور تشبیہات کے انسانی حسن کہیں نظر نہیں آتا مجاز وہ شاعر ہے جس کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔

میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے" اسی دنیا کی عورت جسے آپ چلتا پھرتا روز دیکھتے ہیں۔ یہی نہیں مجاز نے عورت کو پہلی بار عورت ہی نہیں کہا بلکہ اُسے نکتہ داں بھی بنا دیا۔ حسن کے ساتھ ساتھ

"مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُس کی"

اور بجائے خونِ دل پلانے اور لختِ جگر کھلانے کے اچھی خاصی آدمیت کی

باتیں کرتی ہیں...... اور......

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے، میرے اندیشے مٹائے ہیں

لیکن یہ کیا کہ

کوئی میرے سوا اُس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

لاحول ولا قوۃ! کہیں یہ سب کچھ مجازؔ کے شاعرانہ دماغ کا دھوکہ تو نہیں ورنہ یہ حقیقی جاگتی عورت ہے جسے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ کہیں اس کی یہ تمنا تو نہیں جسے وجود میں لانے کی یہ ساری جستجو ہے۔ جس کے بغیر خود اس کا وجود ادھورا اور حیران ہے۔ جس کے انتظار میں وہ اور اس کا وطن غلامی کی بیڑیاں پہنے گھل رہے ہیں۔ جسے وہ چیخ چیخ کر پکار رہا ہے کہ:

آ دل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مگر جی نہیں مانتا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے تخیل سے کہہ رہا ہے۔' نوجوان خاتون، بیوی نہیں عورت ہے، جو شمعِ حرم یا گھر کی رونق ہی نہیں بلکہ ایک ساتھی ہے۔ جو زندگی کی دوڑ میں کندھوں پر سوار نہیں بلکہ نصف بوجھ کاندھوں پر لئے قدم بقدم ساتھ ہے جس کا مقصدِ زندگی ......

'حجابوں میں جینا، حجابوں میں مرنا"

نہیں ہے۔

تمام یقین ہے کہ اگر عورت گھر سے نکل کر کام کاج شروع کر دے تو

کی نسائیت اور حسن مارا جاتا ہے ۔ وہ بالکل کاروباری اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے ۔ اس میں وہ نسائیت اور لطافت باقی نہیں رہتی ۔ مجاز کی رائے میں حسین شے خواہ باہر رکھو خواہ اندر حسین ہی رہے گی ۔ بات یہ ہے کہ مجاز نے ایسی مثال بھی دیکھی ہے کہ جہاں عورتیں تعلیم یافتہ بھی ہیں ، دُنیا کے کاموں میں حصہ لے رہی ہیں اور نسائیت سے بھی محروم نہیں ہیں ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شروع شروع میں تعلیم کا جو اثر ہوا تھا وہ بہت کچھ اس مغالطہ میں ڈالنے والا تھا ۔ جب عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا اور رنڈی کا پیشہ اختیار کرنا ایک ہی درجہ کا جرم سمجھا جاتا تھا ۔ اس زمانہ میں جو لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں وہ اپنے آپ کو بالکل پاکباز اور مقدس ظاہر کرنے کے لیے بالکل ننوں کی سی زندگی گزارتی تھیں لیکن اب جبکہ تعلیم نسواں کا مسئلہ حل ہی ہو چکا ہے اور لڑکیاں آزادی سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں ۔ وہ بالکل غیر دلچسپ اور مردوں نہیں ہوتیں اور نہ ہی اُن کی نسوانیت وغیرہ غائب ہو جاتی ہے ۔ وہ مختلف شعبوں میں کام کرتی ہیں اور لوازمات زینت سے کبھی غافل نہیں ہوتیں عشق و عاشقی کو کبھی گناہ نہیں سمجھتیں ۔ باوجود کہنہ خیال لوگوں کی چیخ و پکار کے مجاز کے تخیل کی عورت نے دُنیا میں قدم رکھ دیا ہے اور اس قدم کو بڑھائے چلی رہی ہے ۔ اور مجاز کی التجا کہ

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

خالی نہیں گئی ۔ عورت کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پر مجھے تو تعجب ہے کہ جب مجازؔ نے پکارا کہ

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں

تو کسی نے لبیک نہ کہا۔ کسی نے اُس کے بلاوے نہ سُنے۔ اجی کون سنتا ہے ان بے جھنکار ریوتوں کو۔ کہنے والے کہتے ہیں' ہندوستان میں لڑکیوں کی افراط ہے' ہوگی۔ شاید صرف شادی کے بازار میں جہاں گرانی کے مارے ایسے ویسے کا گذر نہیں' مال پڑے گھنا کرتے ہیں۔ اِدھر خالی جیبوں والے منہ تکتے ہیں۔ یا پھر بلیک مارکیٹ میں اڑن کھٹولوں پر ٹکٹ لو یا پھر آسمان کی سیر کراؤ۔

اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں

ویسے میں نے خود صنف نازک کو روتا روتے سُنا ہے کہ مرد' نہیں آزادی نہیں دیتے۔ اللہ جانے وہ آزادی کب ملے گی' اور نہیں کون لا کر دے گا۔ اور جب تک یوں ہی رونے روئے جائیں گے اور شاعر چیختے چیختے تھک جائیں گے۔ اس سپاہی کی طرح جس کا ایک ہاتھ آزاد ہو اور دوسرا پیٹھ کے پیچھے مروڑ کر باندھ دیا گیا ہو۔ اور پیٹھ کے پیچھے مروڑا ہوا زخمی ہاتھ اسی طرح لاچاری سے کراہتا رہے گا۔ کاش! یہ ہاتھ اپنی انگلیوں کو ہلا ہلا کر دو چار گرہیں کھول دیتا تو پھر بہت سی گرہیں آپ سے آپ سرکتی چلی جاتیں۔

(نئے ادب کے معمار میں سے)

تعارف

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ اُلفت کا طلبگار ہوں میں

عشق ہی عشق ہے دُنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد
اور اِک شاعرِ بیدار ہوں میں

چھیڑتی ہے جسے مضرابِ الم
سازِ فطرت کا وہی تار ہوں میں

رنگِ نظارۂ قدرت مجھ سے
تازۂ عارض و رخسار ہوں میں

نشۂ نرگسِ خوباں مجھ سے
جانِ رنگینیٔ کہسار ہوں میں

عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اُس کا بھی گنہگار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

رشکِ صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں

لے کے نکلا ہوں گہر ہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں

دیر و کعبہ میں مرے ہی چرچے
اور رُسوا سرِ بازار ہوں میں

اہلِ دُنیا کے لئے ننگ سہی
رونقِ انجمنِ یار ہوں میں

عین اس بے سروسامانی میں	کیا یہ کم ہے کہ ٹھہر رہا ہوں میں
میری باتوں میں مسیحائی ہے	لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں
مجھ سے برہم ہے مزاجِ پیری	مجرمِ شوخیٔ گفتار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں	نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں
محفلِ دہر پہ طاری ہے جمود	اور وارفتۂ رفتار ہوں میں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ! لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانہ میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانہ میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانہ میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
اُن کو پا سکتا ہوں میں، یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے، یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اِک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹّھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹّھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹّھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں!
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، میں سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اِک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اُس کے چمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اِس کا گلشن پھونک دوں، اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

★

ایک دوست کی "خوش مذاقی" پر

ہو نہیں سکتا تری اس خوش مذاقی کا جواب
شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
رکھ بھی دے اب اس کتابِ خشک کو بالائے طاق
اُڑ رہا ہے رنگ و بُو کی بزم میں تیرا مذاق
چھپ رہا ہے پردۂ مغرب میں مہرِ زر فشاں
دید کے قابل ہیں بادل میں شفق کی سُرخیاں
موجزن جوئے شفق ہے اس طرح زیرِ سحاب
جس طرح رنگین شیشوں میں جھلکتی ہے شراب
اک نگارِ آتشیں ہر شے پہ ہے چھایا ہوا
جیسے عارض پر عروسِ نو کے ہو رنگِ حیا
شانۂ گیتی پہ لہرانے کو ہیں گیسوئے شب
آسماں پر منعقد ہونے کو ہے بزمِ طرب

اُڑ رہے ہیں جستجو میں آشیانوں کے طیور
آ چلا ہے آئینہ میں چاند کے ہلکا سا نور

دیکھ کے یہ شام کے نظارہ ہائے دل نشیں
کیا ترے دل میں ذرا بھی گدگدی ہوتی نہیں
کیا تری نظروں کو یہ رنگینیاں بھاتی نہیں
کیا ہوائے سرد تیرے دل کو تڑپاتی نہیں
کیا نہیں ہوتی تجھے محسوس مجھ کو سچ بتا
تیز جھونکوں میں ہوا کے گنگنانے کی صدا
سبزۂ و گل دیکھ کر تجھ کو خوشی ہوتی نہیں
اُف ترے احساس میں اتنی بھی رنگینی نہیں
حُسنِ فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں
میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

★

نغمۂ ٹیگور

(ترجمہ از گارڈنر)

میں نے ہنگامِ صبح اے دُنیا! — تیرے گلشن سے ایک گُل توڑا
اپنے سینہ پہ دی جگہ اُس کو! — چُبھ گیا دل میں لیکن اک کانٹا
شام ہوتے ہی میں نے یہ دیکھا — گُل تھا پژمردہ، درد باقی تھا
حُسن وخوشبو میں اک سے بڑھ کر — اور بھی ہو گئے تجھ میں گُل پیدا
میری گُل چینیوں کا وقت مگر — ایک مدت ہوئی کہ ختم ہوا

اور اب جبکہ رات طاری ہے
گُل نہیں پاس، درد باقی ہے

شوقِ گریزاں

دیر و کعبہ کا میں نہیں قائل
دیر و کعبہ کو آستاں نہ بنا

مجھ میں تو روحِ سرمدی مت پھونک
رونقِ بزمِ عارفاں نہ بنا

دشتِ ظلمات میں بھٹکنے دے
میری راہوں کو کہکشاں نہ بنا

عشرتِ جہل و تیرگی مت چھین
محرمِ رازِ دو جہاں نہ بنا

بجلیوں سے جہاں نہ ہو چشمک
اُس گلستاں میں آشیاں نہ بنا

خارِ چشمِ حریف رہنے دے
حرزِ بازوئے دوستاں نہ بنا

میری خود بینیاں نہ لے مجھ سے
جلوہ افروزِ مہوشاں نہ بنا

دلِ صد پارۂ حوادث کو
تختۂ مشقِ گل رخاں نہ بنا

میری خودداریوں کا خون نہ کر   مطربِ بزمِ دلبراں نہ بنا

ماہ و انجم سے مجھ کو کیا نسبت   مجھ کو اُن کا مزاجداں نہ بنا

جس کو اپنی خبر نہیں رہتی   اُس کو سالارِ کارواں نہ بنا

میری جانب نگاہِ لطف نہ کر   غم کو اس درجہ کامراں نہ بنا

اس زمیں کو زمیں ہی رہنے دے   اس زمیں کو تو آسماں نہ بنا

میری ہستی نیاز و شوق سہی   اِس کو عنوانِ داستاں نہ بنا

رازِ تیرا چھپا نہیں سکتا
تو مجھے اپنا رازداں نہ بنا

★

دِلّی سے واپسی

رخصت اے دِلّی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بہ لب جاتا ہوں میں

یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسماں
رہ چکے ہیں میری جولانگاہ تیرے بوستاں
تیرا دل دھڑکا چکے ہیں میرے احساسات بھی
تیرے ایوانوں میں گونجے ہیں میرے نغمات بھی

رشکِ شیرازِ کہن، ہندوستاں کی آبرو
سر زمینِ حُسن و موسیقی، بہشتِ رنگ و بو
معبدِ حُسن و محبت، بارگاہِ سوز و ساز
تیرے بُتخانے حسیں، تیرے کلیسا دلنواز

ذکر یوسف کا تو کیا ہے کجے تری سرکار میں
خود زلیخا آ کے بکتی تھی ترے بازار میں

جنتیں آباد ہیں تیرے در و دیوار میں
اور تو آباد خود شاعر کے قلبِ زار میں

محفلِ ساقی سلامت! بزمِ انجم برقرار
نازنینانِ حرم پر رحمتِ پروردگار

یاد آئے گی مجھے، بے طرح یاد آئے گی تو
عین وقتِ مے کشی آنکھوں میں پھر جائے گی تو

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں

کتنے رنگین عہد و پیماں چھوڑ کر آیا تھا میں
دل نوازانِ چمن کو چھوڑ کر آیا تھا میں

اِک نشیمن میں نے چھوڑا اِک نشیمن چھُٹ گیا
ساز بس چھیڑا ہی تھا میں نے کہ گلشن چھُٹ گیا

دل میں سوزِ غم کی اک دنیا لئے جاتا ہوں میں
آہ تیرے میکدے سے بے پئے جاتا ہوں میں

جاتے جاتے لیکن اک پیماں کئے جاتا ہوں میں
اپنے عزمِ سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں

پھر تری بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور بہ اندازِ دگر آؤں گا میں

آہ وہ چکّر دیے ہیں گردشِ ایام نے
کھول کر رکھ دی ہیں آنکھیں تلخیٔ ایام نے

فطرتِ دل دشمنِ نغمہ ہوئی جاتی ہے اب
زندگی اک برق، اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب

سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا
لالہ زارِ رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا

بربطِ شکستہ

اُس نے جب کہا مجھ سے اِک گیت سنا دو نا!
سرد ہے فضا دل کی، آگ تم لگا دو نا!
کیا حسین تیور تھے، کیا حسین لہجہ تھا
آرزو تھی، حسرت تھی، حکم تھا، تقاضا تھا
گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
یاس کا دھواں اُٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی، بربطِ شکستہ سے

★

مُسافر

مسافر یونہی گیت گائے چلا جا — سرِ رہگذر کچھ سنائے چلا جا

تری زندگی سوز و سازِ محبت — ہنسائے چلا جا رُلائے چلا جا

ترے زمزمے ہیں خنک بھی تپاں بھی — لگائے چلا جا، بجھائے چلا جا

کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے — قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا

حسیں بھی تجھے راستہ میں ملیں گے — نظر مت ملا مسکرائے چلا جا

محبت کے نقشے تمنا کے خاکے — بنائے چلا جا مٹائے چلا جا

قدامت حدیں یہ کھینچتی ہی رہے گی — قدامت کی بنیاد ڈھائے چلا جا

مجسم شوق کی فطرتِ مضطرب کی — یونہی نت نئی دھن میں گائے چلا جا

جو پرچم اُٹھا ہی لیا سرکشی کا

اُسے آسماں تک اُڑائے چلا جا

★

نوجوان خاتون سے

حجابِ فتنہ پرور اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردا بنا لیتی تو اچھا تھا

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

تری چینِ جبیں خود اک سزا قانونِ فطرت میں
اسی شمشیر سے کارِ سزا لیتی تو اچھا تھا

یہ تیرا زرد رُخ، یہ خشک لب، یہ وہم، یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا

دلِ مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل؟
تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا

ترے زیرِ نگیں گھر ہو، محل ہو، قصر ہو، کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارضِ وسما لیتی تو اچھا تھا

اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو سازِ بیداری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

عیاں ہیں، دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبے
اُنھیں تو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اِک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

★

ساقی

مری مستی میں بھی اب ہوش ہی کا طور ہے ساقی
ترے ساغر میں یہ صہبا نہیں کچھ اور ہے ساقی

بھڑکتی جا رہی ہے دم بدم اِک آگ سی دل میں
یہ کیسے جام ہیں ساقی، یہ کیسا دور ہے ساقی

وہ شے دے جس سے نیند آ جائے عقلِ فتنہ پرور کو
کہ دل آزردۂ تمئیز لطف و جور ہے ساقی

کہیں اِک رند اور واماندۂ افکارِ تنہائی
کہیں محفل کی محفل طور سے بے طور ہے ساقی

جدائی اور یوں گھِر جائے طوفانِ حوادث میں
خدا رکھے ابھی تو بے خودی کا دور ہے ساقی

چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اُس مے کا کیا کہنا
ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی

مجھے پینے دے پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

★

مزارِ رہنما

بر مزار ڈاکٹر انصاری مرحوم

مُتیں اربابِ دل اہلِ نظر بھی
نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی

جمالِ قوم بھی صاحب نظر بھی
مسافر بھی خضر بھی چارہ گر بھی

خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں
خروشِ برق و طوفانِ شرر بھی

سکونِ دیدۂ تقدیسِ کلیسا !
گدازِ اُمّتِ خیرُ البشر بھی

یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گزر بھی

★

اِدھر بھی آ

یہ جہد و کش مکش یہ خروشِ جہاں بھی دیکھ
انبار کی سروں پہ گھنی بدلیاں بھی دیکھ
یہ توپ، یہ تفنگ، یہ تیغ و سناں بھی دیکھ

او کشتۂ نگارِ دل آرا، ! ادھر بھی آ

آ، اور بگل کا نغمۂ "جاں آفریں" بھی سُن
آ، بے کسوں کا نالۂ اندوہگیں بھی سُن
آ، یاغیوں کا زمزمۂ آتشیں بھی سُن

او مستِ ساز و بربط و نغمہ ! ادھر بھی آ

تقدیر کچھ ہو کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ، منتظر ہے عشرتِ فردا، ادھر بھی آ

★

گریز

یہ جا کر کوئی بزمِ خوباں میں کہہ دو
کہ اب درخورِ بزمِ خوباں نہیں میں!
مبارک تمہیں قصر و ایواں تمہارے
وہ دلدادۂ قصر و ایواں نہیں میں
جوانی بھی سرکش، محبت بھی سرکش
وہ زندانیِ زلفِ پیچاں نہیں میں
تڑپ میری فطرت تڑپتا ہوں لیکن
وہ زخمیِ پیکانِ مژگاں نہیں میں
تڑپتا ہے دل اب بھی راتوں کو لیکن
وہ نوحہ گرِ دردِ ہجراں نہیں میں

بایں تشنہ کامی، بایں تلخ کامی!
رہینِ لبِ شکّر افشاں نہیں میں
شراب و شبستاں کا مارا ہوا ہوں
وہ غرقِ شراب و شبستاں نہیں میں
قسم نطق کی شعلہ افشانیوں کی
کہ شاعر تو ہوں، اب غزلخواں نہیں میں

مادام

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لیے
لب پہ افسوں لئے آنکھوں میں مے ناب لیے
ہر نفس روح میں لئے شورشِ طغیانِ نہاں
ہر نفس شوق کا افسانۂ بے تاب لئے
سحر و اعجاز لئے جنبشِ مژگانِ دراز
خندۂ شوخِ جمالِ رُخِ خوش آب لئے
ضو فگن روئے حسیں پر شبِ مہتاب شباب
چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لئے
نشۂ نازِ جوانی میں سراپا و ادا
جسم ذوقِ گہر اطلس و کمخواب لئے

زلفِ شبرنگ لیے صندل و عود و عنبر
خمِ ابروئے حسیں دیر کی محراب لیے
لبِ گلرنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں
شوخیٔ برق لیے، گردشِ سیماب لیے
ایک صیاد خوش اندام سوادِ مشرق
زلفِ بنگال لیے، طلعتِ پنجاب لیے
نزہت و ناز کا اِک پیکرِ شاداب و حسیں
نکہت و نور کا اُمڈا ہوا سیلاب لیے
میری وارفتگیٔ شوق مسلّم، لیکن
کس کی آنکھیں ہیں زلیخا کا حسیں خواب لیے

★

الٰہ آباد سے

بتاریخ ۲ فروری ۱۹۴۵ء جس دن سنگم کی رومان خیز
سرزمین پر جشنِ سالگرہ لکھنے والے شاعر کی سالگرہ منائی گئی

الٰہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے
کہ "دِلّی کا شرابی" آگیا ہے
بہ صد آوارگی با صد تباہی
بہ صد خانہ خرابی آگیا ہے
گلابی لاؤ، چھلکاؤ، لنڈھاؤ
کہ شیدائے گلابی آگیا ہے
نگاہوں میں خمارِ بادہ لے کر
نگاہوں کا شرابی آگیا ہے
وہ سرکش، رہزنِ ایوانِ خوباں
بہ عزمِ باریابی آگیا ہے

وہ رُسوائے جہاں ناکام دوراں
یہ زعمِ کامیابی آگیا ہے
بتانِ نازفرما سے یہ کہہ دو
کہ اِک ترکِ شہابی آگیا ہے
نواسنجانِ سنگم کو بتا دو
حریفِ فاریابی آگیا ہے
یہاں کے شہریاروں کو خبر دو
کہ مردِ انقلابی آگیا ہے

★

غزلیات

یونہی بیٹھے رہو بس دردِ دل سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر
دکھا دے ایک دن اے حُسنِ رنگیں جلوہ گر ہو کر
وہ نظارہ جو ان آنکھوں میں رہ جائے نظر ہو کر
دلِ سوز آشنا کے جلوے تھے جو منتشر ہو کر
فضائے دہر میں چمکا کئے برق و شرر ہو کر
وہی جلوے جو اک دن دامنِ دل سے گریزاں تھے
نظر میں رہ گئے گلہائے دامانِ نظر ہو کر
فلک کی سمت کس حسرت سے تکتے ہیں معاذ اللہ
یہ نالے نارسا ہو کر، یہ آہیں بے اثر ہو کر
یہ کس کے حُسن کے رنگین جلوے چھائے جاتے ہیں
شفق کی سرخیاں بن کر، تجلی سحر ہو کر

★

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دُنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں
یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذاللہ
تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں
اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے
جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں
بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں
کبھی یہ زعم کہ تو مجھ سے چھپ نہیں سکتا
کبھی یہ وہم کہ خود بھی چھپا ہوا ہوں میں
مجھے سُنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت،
مجازؔ! ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

رہِ شوق سے اب ہٹا چاہتا ہوں
کششِ حُسن کی دیکھنا چاہتا ہوں

کوئی دل سا دردآشنا چاہتا ہوں
رہِ عشق میں رہنما چاہتا ہوں

تجھی سے تجھے چھیننا چاہتا ہوں
یہ کیا چاہتا ہوں یہ کیا چاہتا ہوں

خطاؤں پہ جو مجھ کو مائل کرے پھر
سزا اور ایسی سزا چاہتا ہوں

وہ مخمور نظریں، وہ مدہوش آنکھیں
خرابِ محبت ہوا چاہتا ہوں

وہ آنکھیں جھپکیں وہ کوئی مسکرایا
پیامِ محبت سُنا چاہتا ہوں

تجھے ڈھونڈتا ہوں تری جستجو ہے
مزا ہے کہ خود گم ہوا چاہتا ہوں
یہ موجوں کی بیتابیاں کون دیکھے
میں ساحل سے اب لوٹنا چاہتا ہوں
کہاں کا کرم اور کیسی عنایت
مجازؔ اب جفا ہی جفا چاہتا ہوں

سینے میں اُن کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

تاثیرِ جذبِ شوق دکھائے ہوئے تو ہیں
ہم تیرا ہر حجاب اُٹھائے ہوئے تو ہیں

ہاں کیا ہوا وہ حوصلۂ دیدِ اہلِ دل
دیکھو نا وہ نقاب اُٹھائے ہوئے تو ہیں

تیرے گناہگار، گناہگار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں

اللہ ری کامیابیٔ آوارگانِ عشق
خود گم ہوئے تو کیا اُسے پائے ہوئے تو ہیں

یوں تجھ کو اختیار ہے تاثیر دے نہ دے
دستِ دُعا ہم آج اُٹھائے ہوئے تو ہیں

ذکر اُن کا گر زباں پہ نہیں ہے تو کیا ہوا
اب تک نفَس نفَس میں سمائے ہوئے تو ہیں

مٹتے ہوؤں کو دیکھ کے کیوں رو نہ دیں مجازؔ
آخر کسی کے ہم بھی مٹائے ہوئے تو ہیں

عیش سے بے نیاز ہیں ہم لوگ
بے خودِ سوز و ساز ہیں ہم لوگ

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

بے سبب التفات کیا معنی؟
کچھ تو اے چشمِ ناز ہیں ہم لوگ

محفلِ سوز و ساز ہے دُنیا
حاصلِ سوز و ساز ہیں ہم لوگ

کوئی اس راز سے نہیں واقف
کیوں سراپا نیاز ہیں ہم لوگ

ہم کو رسوا نہ کر زمانے میں

بسکہ تیرا ہی راز ہیں ہم لوگ

سب اِسی عشق کے کرشمے ہیں!

ورنہ کیا اے مجازؔ ہیں ہم لوگ!

★

حسن پھر فتنہ گر ہے کیا کہیے
دل کی جانب نظر ہے کیا کہیے

پھر وہی رہگذر ہے کیا کہیے
زندگی راہ پر ہے کیا کہیے

حسن خود پردہ در ہے کیا کہیے
یہ ہماری نظر ہے کیا کہیے

آہ تو بے اثر ہے برسوں سے
نغمہ بھی بے اثر ہے کیا کہیے

حسن ہے اب نہ حسن کے جلوے
اب نظر ہی نظر ہے کیا کہیے

آج بھی ہے مجاز خانہ نشیں
اور نظر عرش پر ہے کیا کہیے

برباد تمنّا پہ عتاب اور زیادہ

ہاں میری محبّت کا جواب اور زیادہ
روئیں نہ اب اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ
"آوارہ و مجنوں" ہی پہ موقوف نہیں کچھ
ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ
اٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے دل سے
دیکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ
ٹپکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے
دھڑکے گا دلِ خانہ خراب اور زیادہ
ہو گی مری باتوں سے انہیں اور بھی حیرت
آئے گا انہیں مجھ سے حجاب اور زیادہ
اے مطربِ بیباک کوئی اور بھی نغمہ
اے ساقیٔ فیاض شراب اور زیادہ

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں
یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
سبھی ہے حسن مگر عشق کا جواب نہیں
مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں
جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں موردِ عتاب نہیں
یہاں تو حسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں

یہاں تو رات کی بیداریاں مسلّم ہیں
مگر وہاں بھی حسیں انکھڑیاں ہیں خواب نہیں

نہ پوچھئے مری دُنیا کو میری دُنیا میں
خود آفتاب بھی ذرّہ ہے آفتاب نہیں

سب ہی میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں

مجازؔ! کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیابِ محبت بھی کامیاب نہیں

★

عقل کی سطح سے کچھ اور اُبھر جاتا تھا
عشق کو منزلِ پستی سے گذر جانا تھا

جلوے تھے حلقۂ ہر دامِ نظر سے باہر
میں نے ہر جلوے کو پابندِ نظر جانا تھا

حُسن کا غم بھی حسیں فکر حسیں درد حسیں
اُن کو ہر رنگ میں ہر طور سنور جانا تھا

حُسن نے شوق کی ہنگامی تو دیکھے تھی بہت
عشق کے دعوئے تقدیس سے ڈر جانا تھا

یہ تو کیا کہئے چلا تھا میں کہاں سے ہمدم
مجھ کو یہ بھی نہ تھا معلوم کدھر جانا تھا

حسن اور عشق کو دے طعنۂ بیداد مجاز
تم کو تو صرف اسی بات پہ مر جانا تھا

★

سازگار ہے ہمدم ان دنوں جہاں اپنا
عشق شادماں اپنا، شوق کامراں اپنا

آہِ بے اثر کس کی، نالۂ نارسا کس کا
کام بارہا آیا، جذبۂ نہاں اپنا

کب کیا تھا اس دل پر حسن نے کرم اتنا
مہرباں اس درجہ کب تھا آسماں اپنا

الجھنوں سے گھبرائے میکدے میں در آئے
کس قدر تن آساں ہے ذوقِ رائیگاں اپنا

کچھ نہ پوچھ اے ہمدم، ان دنوں مرا عالم
مطربِ حسیں اپنا، ساقیِ جواں اپنا

عشق اور رسوائی، کون سی نئی شے ہے
عشق تو ازل سے تھا رسوائے جہاں اپنا

تم مجازؔ دیوانے مصلحت سے بیگانے
ورنہ ہم بنا لیتے تم کو رازداں اپنا

★

ساقیِ گلفام باصد اہتمام آہی گیا
نغمہ برلب، خم بہ سر، بادہ بجام آہی گیا
اپنی نظروں میں نشاطِ جلوۂ خوباں لئے
خلوتیِ خاص سوئے بزمِ عام آہی گیا
میری دنیا جگمگا اُٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پر مرا ماہِ تمام آہی گیا
جھوم جھوم اُٹھے شجر، کلیوں نے آنکھیں کھول دیں
جانبِ گلشن کوئی مستِ خرام آہی گیا
پھر کسی کے سامنے چشمِ تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگِ احترام آہی گیا

میری شب اب میری شب ہے میرا بادہ میرا جام
وہ مرا سرو رِ رواں ماہِ تمام آ ہی گیا

بار ہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بار ہا مستی میں لب پر اُن کا نام آ ہی گیا

زندگی کے خاکۂ سادہ کو رنگیں کر دیا
حُسن کام آئے نہ آئے عشق کام آ ہی گیا

کُھل گئی تھی صاف گردوں کی حقیقت اے مجازؔ
خیریت گذری کہ شاہیں زیرِ دام آ ہی گیا

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رُسوا ہو ہی چکا ہے حُسن بھی کیا رُسوا ہوگا

حسن کی بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا ہوگا
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے کیا اچھا ہوگا

واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑو عقبیٰ کی باتیں
اس دُنیا میں کیا رکھا ہے اُس دُنیا میں کیا ہوگا

تم بھی مجازؔ انسان ہو آخر لاکھ چھپاؤ عشق اپنا
یہ بھید مگر کھل جائے گا، یہ راز مگر افشا ہوگا

آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے — دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے

میری نظروں میں حشر بھی کیا ہے — میں نے اُن کا جلال دیکھا ہے

جلوۂ طور خوابِ موسیٰ ہے — کس نے دیکھا ہے کس کو دیکھا ہے

ہائے انجام اس سفینے کا — ناخدا نے جسے ڈبویا ہے

آہ! کیا دل میں اب لہو بھی نہیں — آج اشکوں کا رنگ پھیکا ہے

جب بھی آنکھیں ملیں اُن آنکھوں سے — دل نے دل کا مزاج پوچھا ہے

جب جوانی کہ تھی حریفِ طرب — آج بربادِ جام و صہبا ہے

کون اُٹھ کر چلا مقابل سے — جس طرف دیکھیے اندھیرا ہے

پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک — پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

سچ تو یہ ہے مجاز کی دُنیا

حسن اور عشق کے سوا اور کیا ہے

نہیں یہ فکر کوئی رہبرِ کامل نہیں ملتا
کوئی دُنیا میں مانوسِ مزاجِ دل نہیں ملتا

کبھی ساحل پہ رہ کر شوق طوفانوں سے ٹکرائیں
کبھی طوفاں میں رہ کر فکر ہے ساحل نہیں ملتا

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا

شکستہ پا کو مژدہ خستگانِ راہ کو مژدہ
کہ رہبر کو سراغِ جادۂ منزل نہیں ملتا

وہاں کتنوں کو تخت و تاج کا ارماں ہے کیا کہیے
جہاں سائل کو اکثر کاسۂ سائل نہیں ملتا

یہ قتلِ عام اور بے اذنِ قتلِ عام کیا کہیے
یہ بسمل کیسے بسمل ہیں جنہیں قاتل نہیں ملتا

★

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دُنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دُنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

اُدھر مشکوک ہے میری صداقت
اِدھر بھی بدگمانی کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اُٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجازؔ اِک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

★

جگر اور دل کو بچانا بھی ہے
نظر آپ ہی سے ملانا بھی ہے

محبت کا ہر بھید پانا بھی ہے
مگر اپنا دامن بچانا بھی ہے

جو دل تیرے غم کا نشانہ بھی ہے
قتیلِ جفائے زمانہ بھی ہے

یہ بجلی چمکتی ہے کیوں دم بدم
چمن میں کوئی آشیانہ بھی ہے

خرد کی اطاعت ضروری سہی
یہی تو جنوں کا زمانہ بھی ہے

نہ دُنیا نہ عقبیٰ کہاں جایئے
کہیں اہلِ دل کا ٹھکانہ بھی ہے
مجھے آج ساحل پہ رونے بھی دو
کہ طوفان میں مسکرانا بھی ہے
زمانہ سے آگے تو بڑھیے مجازؔ
زمانہ کو آگے بڑھانا بھی ہے

★

دامنِ دل پہ نہیں بارشِ الہام ابھی
عشق نا پختہ ابھی جذبۂ دل خام ابھی
خود سمجھتا ہوں کہ دعوائے جنوں کیا کیجئے
کچھ گوارا بھی ہے یہ قیدِ در و بام ابھی
یہ جوانی تو ابھی مائلِ پیکار نہیں
یہ جوانی تو ہے سوئے مئے گلفام ابھی
واعظ و شیخ نے سر جوڑ کے بدنام کیا
ورنہ بدنام نہ ہوتی مئے گلفام ابھی
میں بصد فخر یہ زہاد سے کہتا ہوں مجازؔ!
مجھکو حاصل شرفِ بیعتِ خیام ابھی

★

عاشقی جاں فزا بھی ہوتی ہے
اور صبر آزما بھی ہوتی ہے

روح ہوتی ہے کیف پرور بھی
اور سوز آشنا بھی ہوتی ہے

حسن کو کر نہ دے یہ شرمندہ
عشق سے یہ خطا بھی ہوتی ہے

بن گئی رسمِ بادہ خواری بھی
یہ نماز اب قضا بھی ہوتی ہے

جس کو کہتے ہیں "نالۂ برہم"
ساز میں وہ صدا بھی ہوتی ہے

کیا بتاؤں مجاز کی دنیا!
کچھ حقیقت نما بھی ہوتی ہے

★

پرتوِ ساغرِ صہبا کیا تھا
رات اِک حشر سا برپا کیا تھا

کیوں جوانی کی مجھے یاد آئی
میں نے اِک خواب سا دیکھا کیا تھا

حسن کی آنکھ بھی نمناک ہوئی
عشق کو آپ نے سمجھا کیا تھا

عشق نے آنکھ جھکا لی ورنہ
حسن اور حسن کا پردہ کیا تھا

کیوں مجاز آپ نے ساغر توڑا
آج یہ شہر میں چرچا کیا تھا

یہ جہاں بارگہِ رطلِ گراں ہے ساقی
اور اک جہنم مرے سینے میں تپاں ہے ساقی

جس نے یہ باد کیا مائلِ فریاد کیا
وہ محبت ابھی اس دل میں جواں ہے ساقی

ایک دن آدم و حوا بھی کئے تھے پیدا
وہ اخوت تری محفل میں کہاں ہے ساقی

ہر چمن دامنِ گل رنگ ہے خونِ دل سے
ہر طرف شیون و فریاد و فغاں ہے ساقی

ماہ و انجم مرے اشکوں سے گہرتاب ہوئے
کہکشاں نور کی اک جوئے رواں ہے ساقی

حسن ہی حسن ہے جس سمت بھی اٹھتی ہے نظر
کتنا پُر کیف یہ منظر یہ سماں ہے ساقی

زمزمہ ساز کا پائل کی چھناکے کی طرح
بہتر از شورشِ ناقوسِ اذاں ہے ساقی

میرے ہر لفظ میں بیتاب مرا سوزِ دروں
میری ہر سانس محبت کا دھواں ہے ساقی

★

متفرق اشعار:

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
آپ نے خود بھی تو دامن تہ بچانا چاہا
یوں تو افسانۂ اُلفت تھا ازل سے رنگین
ہم نے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا

★

کس طرف جائے جہاں جائے بتا دے کوئی
زلفِ خم کا گرفتار نگاہوں کا قتیل
عالمِ یاس میں کیا چیز ہے اِک ساغرِ مئے
دشتِ ظلمات میں جس طرح خضر کی قندیل
کتنی دشوار ہے پیرانِ حرم کی منزل
اِک طرف فتنۂ ابلیس، اُدھر ربِ جلیل

★

پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک
پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

خود کو بہلاتا تھا آخر خود کو بہلاتا رہا
میں بہ ایں سوزِ دروں ہنستا رہا گاتا رہا
مجھ کو احساسِ فریبِ رنگ و بو ہوتا رہا
میں مگر پھر بھی فریبِ رنگ و بو کھاتا رہا

میری دنیائے وفا میں کیا سے کیا ہونے لگا
اک دریچہ بند مجھ پر ایک وا ہونے لگا
اِک نگارِ ناز کی پھرنے لگیں آنکھیں مجازؔ!
اِک بُتِ کافر کا دل درد آشنا ہونے لگا

★

مئے گلفام بھی ہے، سازِ عشرت بھی ہے ساقی بھی
مگر مشکل ہے آشوبِ حقیقت سے گذر جاتا

★

عشق کا ذوقِ نظارہ مفت میں بدنام ہے
حُسن خود بیتاب ہے جلوے دکھانے کے لئے

★

دل کو محوِ غمِ دلدار کیئے بیٹھے ہیں
رند بنتے ہیں مگر زہر پیئے بیٹھے ہیں
چاہتے ہیں کہ ہر اِک ذرّہ شگوفہ بن جائے
اور خود دل میں اک خار لئے بیٹھے ہیں

★

وقت کی سعیٔ مسلسل کارگر ہوتی گئی
زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی
سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا سازِ حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

★

پھر کسی کے سامنے چشمِ تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگِ احترام آ ہی گیا
بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب پر ان کا نام آ ہی گیا

★

اپنا غم اوروں کو دے اوروں کا غم لینے سے کیا
تیری کشتی پار لگ جائیگی اس کھینے سے کیا
بات تو جب ہے کہ مر جا عرصہ ہائے رزم میں
اس پہ دم دینے سے کیا اور اس پہ دم دینے سے کیا

★

کچھ تمہاری نگاہ کافر تھی
کچھ مجھے بھی خراب ہونا تھا

★

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

★

میں کہ بربادِ نگارانِ دل آرا ہی سہی
میں کہ رُسوائے مے و ساغر و مینا ہی سہی
میں کہ مقتولِ گُلِ و نرگسِ شہلا ہی سہی
پھر بھی خاکِ رہِ صاحب نظراں ہوں اے دوست

★

مجھے ساغر دوبارہ اُل گیا ہے
تلاطم میں کنارا اُل گیا ہے
مری بادہ پرستی پر نہ جا تُو!
جوانی کو سہارا اُل گیا ہے

★

مجرمِ سرتابیٔ حُسنِ جواں ہو جائیے
گلفشانی تا کجا شعلہ فشاں ہو جائیے
کھائیے گا اِک نگاہِ لطف کا کب تک فریب
کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جائیے

★

یہ کل شب کون میری شوخ گفتاری پہ برہم تھا
سرورِ بادہ گلرنگ تھا بے شک مگر کم تھا
نوائے شوق تھی اور پاسدارِ رسم و آئیں تھی
سرودِ سوزِ مستی تھا، مگر شائستۂ غم تھا

★

اے شاعرِ آشفتہ و مستِ مئے پرجوش
کیا کہہ گیا شعروں میں تجھے یہ بھی نہیں ہوش
اِک پیکرِ الطاف و عنایت پہ یہ طعنے
احسان فراموش ارے احسان فراموش

★

میری عزت گئی نہ آن گئی
عیدِ سوزِ نہاں کو مان گئی
چارہ سازیِ انبساط نہ پوچھ
ایک غم آشنا کی جان گئی

★

یہ مانا آج دل فرطِ الم سے پارا پارا ہے
بلندی دیکھنے والے کو پستی بھی گوارا ہے
ہزاروں کیلئے میں گر چکا ہوں بامِ گردوں سے
ہزاروں وہ ہیں جن کو میں نے گردوں سے اتارا ہے

★

جوانی کی نگاہیں دیکھتی ہیں عینِ مستی میں
اجل کا وحشیانہ رقص عرصہ گاہِ ہستی میں
ضعیفی محفلِ عشرت سے خرقہ پوش آتی ہے
جوانی جب بھی آتی ہے کفن بر دوش آتی ہے

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

زہد سے اجتناب زور پہ ہے
ذکرِ جام و شراب زور پہ ہے
کیا نہ ہو گا مجاز! اب یوں بھی
ابھی میرا شباب زور پہ ہے

کفر کیا، تثلیث کیا، الحاد کیا، اسلام کیا
تو بہر صورت کسی زنجیر میں جکڑا ہوا
توڑ سکتا ہو تو پہلے توڑ دے سب قید و بند
بیڑیوں کے ساز پر نغماتِ آزادی نہ گا

یہ کوٹ بھی سفید، یہ پتلون بھی سفید
تیرے سفید ہیٹ کا ہے اون بھی سفید
خود جسم بھی سفید ہے اور اس کے ساتھ ساتھ
میں تو یہ جانتا ہوں ترا خون بھی سفید

خرمنِ دل جلا رہا ہوں میں
نقشِ ہستی مٹا رہا ہوں میں
تو نہ مغموم ہو مگر اے دوست
تیری ہی سمت آ رہا ہوں میں

★

حجابِ ناز میں جلوے چھپائے جاتے ہیں
جہاں میں اہلِ نظر آزمائے جاتے ہیں
ابھی بہار بہت دور ہے مگر دل میں
جنونِ عشق کے آثار پائے جاتے ہیں
مٹا دیا ہے مجھے عشق نے مجازؔ مگر
ستانے والے ابھی تک ستائے جاتے ہیں

★

وعدہ ترا گو وعدۂ باطل تو نہیں ہے
یہ باعثِ تسکینِ غمِ دل تو نہیں ہے
کیوں خوش ہے کوئی خستۂ و واماندۂ طوفاں
یہ موجِ بلا ہے کوئی ساحل تو نہیں ہے

★

پہلے وہ جور پر پشیماں تھے
اور اب لطف پر پشیماں ہیں

★

جگر کی خبر ہے نہ دل کی خبر
مگر لڑ رہی ہے نظر سے نظر

یہ سب جن کے ہیں خون سے ہاتھ تر
یہی تھے مسیحا، یہی چارہ گر

★

اک سبک اور حسیں کار ابھی گذری ہے
گنگناتی ہوئی سرشار ابھی گذری ہے
سُن رہا ہوں دلِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا
خالقِ حُسن کی شہکار ابھی گذری ہے

★